

مَنَّا يَكُونُ يَسْتَقْبَلُ وَسَيَّةُ الْخَلَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ

کلمہ عام
چہرہ علم

السنة

شماره
02

ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ، دسمبر ۲۰۰۸ء

مدیر

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

★ قربانی کے احکام و مسائل

★ بشریت نبوی ﷺ

★ منتفل کی اقتدا میں مفترض کی نماز

★ حدیث مصراۃ

★ تفسیر زمخشری ایک نظریں

دائرہ تخصص و تحقیق، جہلم، پاکستان



اہل السنۃ کون؟ حافظ ابو یحییٰ نور پوری

علامہ ابوالمظفر السمعانی (المتوفی: ۴۸۹ھ) فرماتے ہیں:

”یاد رہے کہ ہمارے (اہل السنۃ) اور اہل بدعت کے درمیان فرق عقل کے مسئلہ سے ہوتا ہے، انہوں نے اپنے دین کی بنیاد عقل پر رکھی ہوئی ہے، چنانچہ وہ قرآن و سنت کو عقل کے تابع رکھتے ہیں، جبکہ اہل السنۃ کا کہنا ہے کہ دین میں اصل چیز قرآن و سنت کا اتباع ہے، عقل خود اس کے تابع ہے، اگر دین کی بنیاد عقل پر ہوتی تو لوگوں کو وحی اور انبیائے کرام کی ضرورت ہی نہ ہوتی، امر و نہی کا سلسلہ ہی باطل ہو کر رہ جاتا اور جو شخص جو چاہتا کہتا چلا جاتا، نیز اگر دین کی بنیاد عقل پر رکھی جاتی تو مومنوں کے لیے جائز ہوتا کہ جب تک کوئی حکم سمجھ میں نہ آتا، اسے قبول نہ کرتے، حالانکہ جب ہم دین کے اکثر امور مثلاً صفات باری تعالیٰ اور اعتقادی مسائل میں غور و فکر کرتے ہیں تو یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ ہم ان کے حقائق کا ادراک اپنی عقلوں کے ذریعے نہیں کر سکتے، اسی طرح دیگر بہت سے مسائل کا حال ہے جو مسلمانوں میں مشہور و معروف ہیں، سلف صالحین سے منقول ہیں اور انہوں نے باسند نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیے ہیں، مثال کے طور پر عذاب قبر، منکر نکیر کے سوالات، حوض، میزان، پل صراط، جنت اور جہنم کے حالات، نیز اہل جنت اور اہل جہنم کا وہاں ہمیشہ رہنا وغیرہ، ان مسائل کو صرف قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے کا حکم ہے، چنانچہ جب ہم کسی دینی معاملہ میں غور و فکر کے بعد اسے سمجھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اسی کی توفیق سے یہ ممکن ہوا، لیکن جس چیز تک ہمارے ادراک و فہم کی رسائی نہیں ہو سکتی، ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ اس کی ربوبیت و قدرت کا معاملہ ہے، ہمیں اس بارے میں اس کا علم اور اس کی مشیت کافی ہے، اسی بارے میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اور وہ ہی تھوڑا علم دیئے گئے ہو۔“ (الاسراء: ۸۵)

نیز فرمایا: ”اور وہ اس کے علم سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔“ (البقرة: ۲۵۵)

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارے دین کی بنیاد عقل پر ہے اور عقل کی پیروی لازم ہے، اس سے ہمارا سوال ہے کہ بتاؤ، جب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا حکم آجائے جو تمہاری عقل کے خلاف ہو تو کس کو وقعت دو گے، عقل کو یا حکم الہی کو؟ اگر وہ کہے کہ عقل کو تو غلطی پر ہے اور اسلام کے راستے سے ہٹ گیا ہے اور اگر کہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والے حکم پر عمل کروں گا تو اپنی بات پر قائم نہیں رہا۔

جس حکم شرعی کو ہماری عقل سمجھ لے، اسے ایمان و تصدیق سے قبول کریں گے اور جسے نہ سمجھ پائیں، اسے سر تسلیم خم کر کے قبول کریں گے، اسی مفہوم میں اہل السنۃ کا یہ قول ہے کہ اسلام ایسا پل ہے جو سر تسلیم خم کیے بغیر عبور نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کی توفیق دے، اس پر استقامت عطا فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے اپنے

رسول کے دین پر موت دے۔“ (الحجة فی بیان المحجة لأبی القاسم الأصبہانی: ۳۴۷۸-۳۴۹)

بشَرِیتِ نبوی

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بشر تھے، جب پہلی امتوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا تو ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ بشر ہیں، بشر منصب نبوت و رسالت پر فائز نہیں ہو سکتا، اللہ رب العزت نے ان کے اس باطل اور گمراہ کن نظریہ کی تردید فرمائی، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا تو مشرکین مکہ نے بھی یہی اعتراض اٹھایا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَسْرِوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَ وَأَنْتُمْ تَبْصُرُونَ﴾ (الانبیاء: ۳)

”اور (ان ظالموں نے) چپکے چپکے سرگوشیاں کیں کہ وہ تو تم ہی جیسا بشر ہے، پھر کیا وجہ ہے، جو تم آنکھوں دیکھتے جادو میں آجاتے ہو؟“
اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الانبیاء: ۷)

”آپ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر ہم نے بھیجے، سبھی مرد تھے، جن کی طرف ہم وحی اتارتے تھے، پس تم اہل ذکر سے پوچھ لو اگر خود تمہیں علم نہ ہو۔“

اس واضح نص کے باوجود ”قبوری فرقے“ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نور سے نور ہیں، اب ہم اتنی سی وضاحت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر قرآنی دلائل پیش کرتے ہیں:

دلیل نمبر ۱:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ﴾ (الکہف: ۱۱۰ حم السجده: ۶)

”(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا بشر ہوں، میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔“

دلیل نمبر ۲:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۹۳)

”آپ کہہ دیجیے کہ میرا رب پاک ہے، میں صرف ایک بشر (اور) رسول ہوں؟“

دلیل نمبر ۳:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

”درحقیقت اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے، جب انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا۔“

دلیل نمبر ۴:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ﴾ (التوبة: ۱۲۸)

”بے شک تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں، جو تمہاری جنس سے ہیں۔“

دلیل نمبر ۵:

﴿قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۹۵)

”(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجیے کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل رہے ہوتے تو ہم آسمان سے ان کے لیے کوئی فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔“
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

أَيُّ مِنْ جَنَسِهِمْ ، وَلَمَّا كُنْتُمْ أَنْتُمْ بَشَرًا بَعَثْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ لَطْفًا وَرَحْمَةً .

”مراد یہ ہے کہ ان فرشتوں کی جنس سے (فرشتہ رسول بھیج دیتے)، لیکن جبکہ تم بشر تھے تو ہم نے اپنے خاص فضل و کرم سے تمہاری طرف تمہاری جنس سے رسول بھیج دیا۔“ (تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۱۷۴)

ثابت ہوا کہ آپ بشر ہیں اور جنسِ انسانیت سے ہیں، قرآنی دلائل کے بعد اب حدیثی دلائل ملاحظہ فرمائیں:

دلیل نمبر ۱:

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسریٰ کے ترجمان سے کہا:

بَعَثَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِينَ تَعَالَى ذِكْرَهُ وَجَلَّتْ عَظَمَتُهُ الْيَنَّا نَبِيًّا مِنْ أَنْفُسِنَا نَعْرِفُ أَبَاهُ وَأُمَّهُ .

”زمین و آسمان کے رب نے ہماری طرف ہماری جس سے ایک نبی بھیجا ہے، جن کے والدین کو ہم

جانتے ہیں۔“ (صحیح بخاری: ۱/ ۴۴۷، ح: ۳۱۵۹)

دلیل نمبر ۲:

ابو جمرہ نصر بن عمران کہتے ہیں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ہمیں کہا، کیا میں آپ کو ابوذر (غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے قبول اسلام کے بارے میں خبر نہ دوں؟ ہم نے عرض کی، ہاں! آپ نے کہا، میں غفار قبیلہ کا فرد تھا فبلغنا أن رجلاً قد خرج بمكة يزعم أنه نبى .

”ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ مکہ میں ایک آدمی ظاہر ہوا ہے، جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔“

میں نے اپنے بھائی (انیس غفاری) سے کہا، آپ اس آدمی کے پاس جائیں اور اس سے بات چیت کریں، میرے پاس اس کے بارے میں خبر لائیں، وہ چلا گیا اور آپ سے ملاقات کی، پھر واپس آیا، میں نے کہا، آپ کے پاس کیا خبر ہے؟ اس نے کہا:

والله لقد رأيت رجلاً يأمر بالخير وينهى عن الشر .

”اللہ کی قسم! میں نے ایک آدمی کو دیکھا ہے، جو خیر و بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے منع کرتا ہے۔“

(صحیح بخاری: ۱/ ۴۹۹، ح: ۳۵۲۲، صحیح مسلم: ۲/ ۲۹۷، ح: ۲۴۷۴)

دلیل نمبر ۳:

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو سخت ترین معاملہ کیا ہے، اس کی مجھے خبر دیں، وہ کہنے لگے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک عقبہ بن ابی معیط آیا، اس نے آپ کو کندھے سے پکڑا اور اپنا کپڑا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں ڈال کر سختی سے آپ کا گلا گھونٹا، سیدنا ابوبکر تشریف لائے اور اس کے کندھے سے پکڑ کر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کر دیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (المؤمن: ۲۸) (کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنے کے درپے ہو، جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن نشانیاں لے کر آیا ہے)۔

(صحیح بخاری: ۲/ ۷۱۷-۷۱۲، ح: ۴۸۱۵)

دلیل نمبر ۴:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: **اللّٰهُمَّ! اِنَّ مُحَمَّدًا بَشَرٌ يَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ** .

”اے اللہ! بے شک محمد بشر ہے، اس کو غصہ آ جاتا ہے، جس طرح ایک بشر کو غصہ آ جاتا ہے۔“

(صحیح مسلم: ۰۳۲۴/۲، ح: ۲۶۰۱)

دلیل نمبر ۵:

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **”میں تو بس بشر ہوں، تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو، ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنے دلائل دعویٰ کے نشیب و فراز کو دوسرے کی نسبت زیادہ سمجھ داری سے پیش کرے، میں (بالفرض) دلائل کی سماعت کی بنیاد پر اس کے حق میں فیصلہ سنا دوں، (یاد رکھو) جس کو میں (دلائل کی ظاہری قوت کے پیش نظر) اس کے بھائی کا معمولی ساق بھی کاٹ کر دے دوں، وہ اسے نہ لے، یقیناً میں نے اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔“** (صحیح بخاری: ۰۱۰۶۲/۲، ح: ۷۱۶۹، صحیح مسلم: ۰۷۴/۲، ح: ۱۷۱۳)

دلیل نمبر ۶:

سیدنا سمرہ بن جندب کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے اجتماع سے خطاب فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَرَسُولُ اللَّهِ** . ”لوگو! میں بشر ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔“ (مسند الامام احمد: ۵/ ۰۱۶، الطبرانی: ۶۷۹۷-۶۷۹۹، المستدرک للحاکم: ۱/ ۳۲۹-۳۳۰)

واخرجه ابو داؤد: ۱۸۴ والنسائی: ۱۴۸۴ والترمذی: ۵۶۲ مختصراً وقال: حسن صحيح، وسنده حسن)

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ (۱۳۹۷) ، امام ابن حبان (۲۸۵۶) نے ”صحیح“ اور حاکم نے بخاری و مسلم کی شرط پر ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

اس حدیث کا راوی ثعلبہ بن عباد العبیدی ”موثق حسن الحدیث“ ہے، امام ابن خزیمہ، امام ترمذی، امام ابن حبان اور حاکم نے اس کی حدیث کی تصحیح کر کے اس کی توثیق کی ہے، لہذا اس کو ”مجہول“ کہنے والوں کا قول مردود ہے۔

دلیل نمبر ۷:

ابو رمثہ کہتے ہیں، میں اپنے والد گرامی کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، جب

میرے باپ نے کہا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے:

وَكُنْتُ أَظُنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا لَا يَشْبَهُ النَّاسَ ، فَذَا بَشَرٌ .
 ”میرے خیال میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں جیسے نہیں ہوں گے، اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ آپ تو بشر ہیں۔“

آپ کے بال مبارک کانوں سے ملے ہوئے تھے، ان پر مہندی لگی ہوئی تھی، آپ پر دو سبز چادریں تھیں، میرے باپ نے آپ پر سلام کہا، پھر ہم بیٹھ گئے، تھوڑی دیر باتیں کیں تو آپ نے میرے والد سے پوچھا، کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا، ہاں، کعبہ کے رب کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے، آپ نے فرمایا، واقعی آپ کا بیٹا ہے؟ تو میرے باپ نے کہا، میں اس پر گواہی دیتا ہوں، میری والد سے مشابہت اور مجھ پر میرے والد کی قسم کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے، فرمایا، اس کے جرم کی سزا آپ کو نہیں ملے گی اور نہ ہی آپ کے جرم کی سزا اس کو ملے گی، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿لَا تَنْزِرُ وَازِرَةً وَزَرَ أَخْوَى﴾ (الأنعام: ۱۶۴، الاسراء: ۱۵، فاطر: ۱۸،

الزمر: ۷) (کوئی جان دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھاتی) پھر میرے والد نے آپ کی جلد مبارک کے ساتھ لگا ہوا زائد گوشت دیکھا تو کہا، اے اللہ کے رسول! میں لوگوں کا علاج کرتا ہوں، کیا آپ کا علاج نہ کروں؟ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں، اس کو پیدا کرنے والا ہی اس کا طبیب ہے۔“ (مسند الامام

احمد: ۲/ ۲۸۰، ۲۲۳/ زوائد مسند الامام احمد: ۲/ ۲۲۸، ۲۲۷/ وسندہ صحیح)

امام حاکم (۲/ ۴۲۵) نے اس کو ”صحیح الاسناد“ کہا ہے۔

دلیل نمبر ۸:

سیدنا رافع بن خدیج انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ، اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخَذُوا بِهِ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَانْمَا اَنَا بَشَرٌ . ”یقیناً میں بشر ہوں، جب میں تمہیں کوئی بھی دینی حکم دوں تو اس پر (نختی سے) عمل پیرا ہو جاؤ اور جب میں تمہیں اپنی رائے سے حکم دوں تو میں بشر ہوں۔“ (صحیح مسلم: ۲/ ۲۶۴، ح: ۲۳۶۲)

دلیل نمبر ۹:

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات سنتا تھا، وہ حفظ و ضبط کے ارادے سے لکھ لیتا تھا، مجھے اس بات سے ہر قریشی (صحابی) نے منع کیا،

انہوں نے کہا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے ہیں، حالانکہ آپ بشر ہیں، غضب و غصہ اور خوشگوااری دونوں حالتوں میں بات کرتے ہیں، عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں، میں حدیث لکھنے سے رک گیا، میں نے اس بات کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے اپنی انگلی مبارک سے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا، لکھا کر، مجھے اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس منہ سے صرف حق نکلتا ہے۔“ (مسند الامام أحمد: ۲/ ۱۶۲، سنن أبی داؤد: ۳۶۶۶، سنن الدارمی: ۴۹۰، المستدرک

للحاکم: ۱/ ۱۰۶-۱۰۵، وسندہ صحیح، وأخرجه أحمد: ۲/ ۲۰۷، مسند البزار: ۲۴۷۰، تاریخ أبی زرعۃ الدمشقی: ۱۵۱۶، الصحابة لأبی القاسم البغوی: ۱۴۷۲، جامع بیان العلم وفضله لابن عبد البر: ۱/ ۸۴-۸۵، وسندہ حسن، التقیید للخطیب: ۸۰، وسندہ حسن)

دلیل نمبر ۱۰:

قاسم بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امورِ خانہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

”کان بشراً من البشر، یفلی ثوبہ، ویحلب شاتہ، ویخدم نفسه .
”آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشروں میں سے ایک بشر تھے، اپنے کپڑوں سے جوئیں تلاش کرتے، اپنی بکریوں کا دودھ دوہتے اور اپنے کام خود کرتے تھے۔“

(مسند الامام أحمد: ۶/ ۲۵۶، وسندہ حسن، حلیۃ الأولیاء لأبی نعیم: ۸/ ۳۳۷، عن عمرة وسندہ حسن، وصحہ

ابن حبان: ۵۶۷۴، الشمائل للترمذی: ۳۴۳، الادب المفرد للبخاری: ۵۴۱، شرح السنۃ: ۳۶۷۶، وهو حسن)

دلیل نمبر ۱۱:

ابو یرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں:

دخلت المسجد مع أبی واذا النبی صلی اللہ علیہ وسلم قاعد فی ظلّ الکعبة، قال لی: أرايت الرجل الذی فی ظلّ الکعبة؟ ذاک رسول اللہ .

”میں اپنے والد کے ہمراہ مسجد (حرام) میں داخل ہوا، وہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے، میرے والد نے مجھے کہا، کیا تو نے وہ شخص دیکھے ہیں، جو کعبے کے سائے میں بیٹھے ہیں، وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔“

(مسند الامام أحمد: ۴/ ۱۶۳، زوائد مسند الامام أحمد: ۲/ ۲۲۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/ ۲۸۲، وسندہ صحیح)

☆.....☆.....☆

دفاعِ حدیث:

مُتَنَفِّل کی اقتداء میں مُفْتَرَض کی نماز (۲)

حافظ ابوبکیٰ نور پوری

دلیل نمبر ۲:

((عن جابر قال : أقبلنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى اذا كنا بذات الرقاع - فذكر الحديث، الى أن قال - فنودی بالصلوة ، فصلّى النّبىّ صلى الله عليه وسلم بطائفة ركعتين ، ثم تأخروا ، فصلّى بالطائفة الأخرى ركعتين ، قال : فكانت لرسول الله صلى الله عليه وسلم أربع ركعات ، وللقوم ركعتان))

”سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے حتیٰ کہ ذات الرقاع جگہ پر پہنچ گئے۔۔ نماز کے لئے اذان کہی گئی، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے، آپ نے دوسرے گروہ کو بھی دو رکعتیں پڑھادیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار رکعتیں ہوئیں اور صحابہ کی دو دو۔“

(صحیح بخاری تعلیقاً: ۵۹۳/۲، ح: ۴۱۳۶، صحیح مسلم موصولاً: ۲، ۲۷۹/ ح: ۸۴۳)

دلیل نمبر ۳:

((عن أبی بکرة قال : فصلّى النّبىّ صلى الله عليه وسلم فى خوف الظّهر، فصفت بعضهم خلفه و بعضهم بازاء العدو ، فصلّى بهم ركعتين ثم سلّم ، فانطلق الذين صلّوا معه فوقفوا موقف أصحابهم ، ثم جاء أولئك فصلّوا خلفه ، فصلّى بهم ركعتين ثم سلّم ، فكانت لرسول الله صلى الله عليه وسلم أربعاً ولأصحابه ركعتين ركعتين ، وبذلك كان يفتى الحسن .))

”سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف کی حالت میں ظہر کی نماز ادا کی، کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور کچھ نے دشمن کے سامنے، آپ نے ان کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر سلام پھیرا، وہ لوگ جو نماز ادا کر چکے تھے، جا کر دوسرے ساتھیوں کی جگہ پر کھڑے ہو گئے، پھر وہ آئے اور آپ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نے ان کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں، اس

طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار رکعتیں ہو گئیں اور صحابہ کی دودو، امام حسن بصری اسی طرح فتویٰ دیتے تھے۔“ (سنن أبی داؤد: ۱۲۴۸، سنن نسائی: ۱۵۵۳، صحیح)

☆ امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) ان دونوں احادیث پر یوں تبویب فرماتے ہیں:

باب صفة صلاة الخوف والعدو خلف القبلة ، وصلاة الامام بكل طائفة ركعتين ، وهذا أيضا الجنس الذي أعلمت من جواز صلاة المأموم فريضة خلف الامام المصلّي نافلة ، اذ احدى الركعتين كانت للنبي صلى الله عليه وسلم تطوعا وللمؤمنين فريضة .

”دشمن قبلہ کے پیچھے ہو، تو نماز خوف کا طریقہ اور امام کا ہر گروہ کو دو رکعتیں پڑھانا، نیز یہ اسی طرح کی دلیل ہے، جو میں نے نفل ادا کرنے والے امام کی اقتدا میں فرض ادا کرنے والے مقتدیوں کی نماز کے جواز میں بتائی تھی، کیونکہ چار میں سے دو رکعتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نفل تھیں اور مقتدیوں کے لئے فرض۔“ (صحیح ابن خزیمہ: ۲۹۷/۲، باب نمبر: ۶۱۵)

☆ امام ابن المنذر (م ۳۱۸ھ) فرماتے ہیں:

وهذا الخبر يدلّ على اباحة أن يصلي المرء الفريضة خلف من يصلي نافلة ، لأن الآخرة من صلاة النبي صلى الله عليه وسلم كانت نافلة .

”یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ فرض پڑھنے والے آدمی کی نماز نفل پڑھنے والے کے پیچھے جائز ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دو رکعت نماز نفل تھی۔“ (الأوسط لابن المنذر: ۵/۳۲)

☆ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) ان احادیث پر یوں باب قائم فرماتے ہیں:

باب الفريضة خلف من يصلي نافلة .

”نفل پڑھنے والے کی اقتداء میں فرض پڑھنے کا بیان۔“ (السنن الكبرى للبيهقي: ۸۵/۳)

☆ حافظ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) نے بھی ان احادیث سے متنفّل کی اقتداء میں مفترض کی نماز کا جواز ثابت کیا ہے۔ (المحلى: ۴/۲۳۶)

☆ حافظ نووی (۶۳۱-۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:

وكان النبي صلى الله عليه وسلم متنفّلا في الثانية وهم مفترضون واستدلّ به الشافعي وأصحابه على جواز صلوة المفترض خلف المتنفّل .

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسری جماعت کی دونوں رکعتوں میں متنفّل تھے اور لوگ مفترض تھے،

امام شافعی اور ان کے موافقین نے اس حدیث سے متنفّل کے پیچھے مفترض کی نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔“ (شرح مسلم از نووی: ۱/ ۲۷۹)

نیز حافظ نووی اپنی کتاب ”خلاصة الأحكام“ میں ان احادیث پر یوں تبویب فرماتے ہیں:

باب صحّة صلاة المفترض خلف المتنفّل .

”متنفّل کی اقتداء میں مفترض کی نماز درست ہونے کا بیان۔“ (خلاصة الاحکام از نووی: ۲/ ۶۹۷)

☆ علامہ زیلعی حنفی لکھتے ہیں:

وعلى كلّ حال ، فالاستدلال على الحنفية بحديث جابر صحيح .

”بہر حال جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے احناف کے خلاف (متنفّل کے پیچھے مفترض کی

نماز کا) استدلال صحیح ہے۔“ (نصب الراية: ۵۷/ ۲)

☆ علامہ سندھی حنفی لکھتے ہیں:

ولا يخفى أنّه يلزم فيه اقتداء المفترض بالمتنفّل قطعاً ولم أر لهم عنه جواباً شافياً .

”بڑی واضح بات ہے کہ اس حدیث میں قطعی طور پر متنفّل کی اقتداء میں مفترض کی نماز کا جواز

ثابت ہوتا ہے، میں نے ان (احناف) کے پاس اس حدیث کا کوئی شافی (مقبول) جواب نہیں پایا۔“

(حاشیۃ السندی علی النسائی)

تاویلات و اعتراضات کا جائزہ:

قارئین! احناف کے قابل قدر امام سندھی حنفی تو فرما رہے ہیں کہ احناف کے پاس اس حدیث کا کوئی شافی جواب نہیں ہے، لیکن پھر بھی بعد والوں نے اس پر اپنے تقلیدی حربے خوب آزمائے ہیں، آئیے ان کا منصفانہ تجزیہ کرتے ہیں:

تاویل نمبر ۱:

جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی صاحب لکھتے ہیں:

قد علمت أن فيه حجة للشافعية في مسألة جواز اقتداء المفترض بالمتنفّل وعجز عن جوابه مثل الزيلعي وابن الهمام ، وحمله الطحاوي على زمان كانت الفرائض فيه تصلّي مرتين ، وقد أجبته عنه جواباً شافياً .

”میں جانتا ہوں کہ اس حدیث میں شوافع کے لئے متنفّل کی اقتداء میں مفترض کی نماز کے جواز کی

دلیل موجود ہے، اس کے جواب سے ذیلی اور ابن ہمام جیسے اکابر احناف بھی عاجز رہے ہیں اور امام طحاوی نے اسے اس زمانے پر محمول کر دیا ہے جب فرض دومرتبہ پڑھے جاتے تھے، البتہ میں نے اس کا شافی جواب دیا ہے۔“ (فیض الباری: ۴/ ۱۰۴)

تبصرہ: کشمیری صاحب اس بات کا تو اقرار کر چکے ہیں کہ اس حدیث میں اس مسئلہ کی دلیل موجود ہے، اس پر طرہ یہ کہ اکابر احناف بھی اس کے جواب سے عاجز رہے، امام طحاوی نے اسے مخصوص زمانے پر محمول کیا ہے، اس کا جواب ہم پیچھے (حدیث معاذ پر اعتراض نمبر ۵ کے تحت تبصرہ) ذکر کر آئے ہیں کہ جس دلیل پر ان کے دعویٰ کی بنیاد تھی، جب وہ دلیل ہی ٹوٹ گئی، تو دعویٰ کی عمارت خود بخود زمین بوس ہو گئی۔ ویسے بھی کشمیری صاحب کے نزدیک یہ کوئی شافی جواب نہیں، لہذا امام طحاوی کا اعتراض تو احناف کے گھر سے ہی ختم ہو گیا۔

اب رہا کشمیری صاحب کا شافی جواب، تو عرض ہے کہ موصوف صحیح حدیث کے خلاف اکثر ایسی طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں، ایک وتر، جو کہ صحیح مسلم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور کئی اکابر احناف اس بات کا اقرار کر چکے ہیں، اس کا بھی شافی جواب تقریباً ۱۳ سال کی ”محنت شاقہ“ کے بعد کشمیری صاحب کے ذہن میں آیا تھا۔

(دیکھیں فیض الباری: ۲/ ۳۷۵، العرف الشذی: ۱/ ۱۰۷، معارف السنن از بنوری: ۴/ ۲۶۴، درس ترمذی از تقی: ۳/ ۲۲۴)

بھلا حدیث پر عمل کا یہی تقاضا ہے کہ اگر وہ امام کے قول کے موافق نہ ہو، تو پوری زندگی اس کا جواب ہی ڈھونڈا جائے، عمل نہ کیا جائے؟ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا یہی طرز عمل تھا؟ کیا امام ابو حنیفہ اور دوسرے ائمہ دین کا یہی درس تھا؟ قارئین! آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ یہ طرز عمل حدیث سے خیر خواہی ہے یا۔۔۔۔؟ یہ اقرار حدیث ہے یا۔۔۔۔؟ اور یہ حدیث کی موافقت ہے یا۔۔۔۔؟

تاویل نمبر ۲:

اب صلوٰۃ خوف والی حدیث کا ”شافی کشمیری جواب“ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

والجواب علی ما ظہر لی أنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلاہا فی ذات الرّقاع علی الصّفة المختارة عند الشّافیّة، فصلی بطائفة رکعة، ثمّ ثبت قائما حتی اتّموا لأنفسهم، وجاءت الأخری، فصلی بهم کذا لک، فاعتبر الرّوی رکعته رکعة، و مکثہ بقدر ما اتّموا

لأنفسهم ركعة أخرى، فعبر عنه بالركعتين، وكانت الركعتان في الحقيقة لمن خلفه صلى الله عليه وسلم، وإنما نسبهما إليه أيضا لتأخيره بتلك المدة، ومكثه فيها، فإذا تضمنت ركعته لركعتيهم تضمنت ركعته لأربعهم لا محالة، وهذا وإن كان يرى تأويلا في بادي النظر، لكنّه مؤيد بما يروى عن جابر في عين تلك القصة، فقد أخرج البخاري: (ص: ٥٩٢، ج: ٢) عن صالح بن خوات عمّن شهد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم ذات الرقاع صلاة الخوف أنّ طائفة صفّت معه، وطائفة وجاه العدو، فصلّى بالتي معه ركعة، ثمّ ثبت قائما، وأتمّوا لأنفسهم، ثمّ انصرفوا فصفّوا وجاه العدو، وجاءت الطائفة الأخرى، فصلّى بهم الركعة التي بقيت من صلاته، ثمّ ثبت جالسا، وأتمّوا لأنفسهم، ثمّ سلّم بهم، اهـ. فهذا صريح في أنّ القوم فرغوا جميعا، فكانت لهم ركعتان ركعتان، وكانت للنبي صلى الله عليه وسلم أيضا ركعتان، كما ذكره الراوى ههنا، لأنه لما مكث بعد ركعة بقدر ركعة، وانتظر القوم عبّر عنه الراوى هناك بالركعة، وعدّ له أربع ركعات بهذا الطريق، ولا بدّ، فإنّ الواقعة واحدة، فلعلّك علمت الآن حال تعبير الرواة أنه لا يبنى على مسألة فقهية فقط، بل يأتي على عبارات و ملاحظ، تسنح لهم عند الرواية.

”جو جواب مجھ پر منکشف ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات الرقاع میں اس طرح نماز پڑھی تھی، جیسے شوافع کے ہاں مختار ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہے حتیٰ کہ صحابہ کرام نے اپنی (دور کعتیں) نماز مکمل کر لی، دوسری جماعت آئی، تو آپ نے ان کو بھی ایسے ہی ایک رکعت نماز پڑھائی اور دوسری صحابہ کرام نے خود مکمل کی، لہذا راوی نے آپ کی رکعت کو بھی ایک رکعت شمار کیا اور آپ کے انتظار کو بھی ایک رکعت شمار کر لیا، یوں دور کعتیں سمجھ لیں، حالانکہ دور کعتیں درحقیقت تو ان صحابہ کی تھیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کی تھی، راوی نے آپ کے ایک رکعت کے بعد ٹھہرنے اور دوسرے صحابہ کا انتظار کرنے کو ملحوظ رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی دور کعتیں منسوب کر دیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک رکعت صحابہ کی دور کعتوں کو متضمن ہو گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور کعتیں صحابہ کی چار رکعتوں کو بھی بلا شبہ متضمن ہو گئیں، یہ بات بظاہر تو ایک تاویل ہی لگتی ہے، لیکن اس کی تائید جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسی واقعہ کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے، بخاری (٥٩٢/ ٢) میں صالح بن خوات اس شخص سے بیان کرتے

ہیں، جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع والے دن نماز خوف پڑھی تھی، کہ صحابہ کرام کے ایک گروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صف بنائی اور دوسرے گروہ نے دشمن کے سامنے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ والے گروہ کو ایک رکعت نماز پڑھائی، پھر کھڑے رہے، حتیٰ کہ انہوں نے اپنی دوسری رکعت مکمل کی، پھر وہ لوٹ گئے اور دشمن کے سامنے صف بنائی، دوسرا گروہ آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بقیہ نماز (دوسری رکعت) پڑھا دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے رہے، حتیٰ کہ صحابہ نے اپنی دوسری رکعت مکمل کر لی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ یہ روایت صریح ہے کہ صحابہ دو دو رکعتیں پڑھ کر فارغ ہوئے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کے فارغ ہونے کے بعد فارغ ہوئے، صحابہ کرام کی دو دو رکعتیں ہوئیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی دو، جیسا کہ راوی نے یہاں ذکر کر دیا، مگر جب آپ ایک رکعت کے بعد ایک رکعت کی مقدار ٹھہرے اور دوسرے صحابہ کا انتظار فرمایا، تو راوی نے اسے بھی ایک رکعت شمار کر لیا، اس طرح آپ کی نماز کو بھی چار رکعتوں کے برابر کر دیا، حالانکہ یقیناً واقعہ ایک ہی ہے، شاید اب ہی آپ کو راویوں کی تعبیر کا حال معلوم ہو جائے کہ یہ تعبیر محض کسی ایک فقہی مسئلے پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ روایت کے وقت راویوں کو جو عبارات سوجھ جائیں، تعبیر انہی کے مطابق ہوتی ہے۔“ (فیض الباری: ۲۴۷/۳)

تبصرہ:

معزز قارئین! دیکھا آپ نے کہ کشمیری صاحب کو حدیث سے جان چھڑانے کی خاطر کتنے پاپو بیلنا پڑے؟ لیکن ان کی اتنی ”محنت“ بھی رنگ نہ لاسکی کیونکہ:

☆ جس روایت پر بناء کر کے کشمیری صاحب نے اتنی بڑی اور بعید تاویل کی ہے، بصر احیٰ محدثین، وہ الگ واقعہ ہے، یہی قصہ نہیں، لہذا کشمیری صاحب کا یہ کہنا کہ ”ولا بدّ، فانّ الواقعة واحدة۔“ (یقیناً یہ ایک ہی واقعہ ہے) کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) جو روایت بخاری کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے، اس میں ”من شهد مع رسول اللہ۔“ (جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع والے دن نماز ادا کی تھی) سے مراد قطعاً جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں ہیں، ائمہ مجتہدین اور فقہاء سے ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے، آج تک کسی عالم نے یہ بات نہیں کہی، بلکہ یہ خالص ”کشمیری انکشاف“ ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

قيل ان اسم هذا المبهم سهل بن أبي حثمة ، لأن القاسم بن محمد روى حديث صلاة الخوف عن صالح بن خوات عن سهل بن أبي حثمة ، وهذا ظاهر من رواية البخارى ، ولكن الرّاجح أنّه أبوه خوات بن جبیر ، لأنّ أبا أويس روى هذا الحديث عن يزيد بن رومان شيخ مالک فيه فقال ، عن صالح بن خوات عن أبيه ، أخرجه ابن مندة في معرفة الصحابة من طريقه ، وكذلك أخرجه البيهقي من طريق عبيد الله بن عمر عن القاسم بن محمد عن صالح بن خوات عن أبيه ، وجزم النووي في تهذيبه بأنه خوات بن جبیر وسبقه لذلك الغزالي فقال : ان صلاة ذات الرقاع في رواية خوات بن جبیر .

”ایک قول یہ ہے کہ اس مبہم راوی کا نام سہل بن ابی حثمہ ہے، کیونکہ قاسم بن محمد نے نماز خوف میں ایک روایت سہل بن ابی حثمہ سے بیان کی ہے اور یہ بات صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہے، لیکن راجح بات یہ ہے کہ مبہم راوی صالح کا باپ خوات بن جبیر ہے، کیونکہ ابوالویس نے بالکل یہی حدیث یزید بن رومان، جو امام مالک کے شیخ ہیں، سے عن صالح بن خوات عن أبيه کے الفاظ سے بیان کی ہے، اس سند سے ابن مندہ نے اسے اپنی کتاب معرفة الصحابة میں بیان کیا ہے، اسی طرح امام بیہقی نے بھی عبيد الله بن عمر عن القاسم بن محمد عن صالح بن خوات عن أبيه کے الفاظ سے بیان کیا ہے، حافظ نووی نے اپنی کتاب التہذیب میں بالجرم بتایا ہے کہ یہ خوات بن جبیر ہیں، ان سے پہلے غزالی نے کہا تھا کہ غزوہ ذات الرقاع میں نماز خوف کا قصہ خوات بن جبیر کی روایت سے ہے۔“

(فتح الباری : ۴۲۲/۷)

موصوف مزید لکھتے ہیں:

ويحتمل أنّ صالحاً سمعه من أبيه ومن سهل بن أبي حثمة فلذلك يبهمه تارة ويعينه أخرى ، الا أن تعيين كونها كانت ذات الرقاع انما هو في روايته عن أبيه وليس في رواية صالح عن سهل أنه صلاها مع النبي صلى الله عليه وسلم....

”یہ بھی احتمال ہے کہ صالح نے اپنے باپ سے بھی سنا ہوا اور سہل بن ابی حثمہ سے بھی، اسی لئے وہ کبھی اسے مبہم رکھتے ہیں اور کبھی تعین کر دیتے ہیں، لیکن ذات الرقاع میں راوی کی تعین صرف عن أبيه سے ہے، سہل بن ابی حثمہ سے نہیں، کیونکہ یہ بات ہی بہت بعید ہے کہ سہل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ نماز پڑھی ہو، کیونکہ ان کی عمر ہی اس غزوہ کے وقت بہت تھوڑی تھی۔“ (فتح الباری: ۴۲۲/۷)

ان تصریحات سے تو روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ صالح بن خوات غزوہ ذاتِ رِقاع کی نماز خوف جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان نہیں کر رہے بلکہ اپنے والد خوات بن جبیر سے بیان کرتے ہیں، لہذا کشمیری صاحب کا یہ کہنا کہ لکنہ مؤید بما یروی عن جابر فی عین تلک القصۃ (اس تاویل کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو اسی واقعہ میں جابر ہی سے مروی ہے) بالکل بے بنیاد ہے۔

(ب) محدثین نے نماز خوف کے بہت سے طریقے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کئے ہیں، جو طریقے آپ سے سند صحیح ثابت ہیں، ان سب پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی لکھتے ہیں:

”حافظ ابن قیم زاد المعاد (۱/ ۱۴۷) میں لکھتے ہیں کہ صلوۃ الخوف کی چھ یا سات صورتیں ہیں و کلھا جائزۃ یہ سب جائز ہیں۔ علامہ ابن حزم نے محلی میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں تیرہ صورتیں لکھی ہیں، قاضی شوکانی نیل الاوطار (۳/ ۳۳۷) میں لکھتے ہیں کہ سترہ صورتیں ہیں، حافظ ابن حجر بحوالہ ابوبکر بن العربی سولہ صورتیں نقل کرتے ہیں (فتح الباری: ۲: ۴۳۷)، امیر میمانی سبل السلام (۲/ ۷۷) میں لکھتے ہیں: وقال ابن حزم صحّ منها أربعة عشر وجها وقال ابن العربي فی عارضة الأحمدي (۳/ ۴۵) فیہا روایات کثیرۃ أصحّها ست عشر رواية. (ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان میں سے ۱۴ طریقے صحیح ثابت ہیں اور ابن العربی کہتے ہیں کہ اس میں بہت سی روایات ہیں، ان میں سے صحیح ترین ۱۶ ہیں)۔ ان میں سے جس پر عمل کرے، درست ہے۔“ (خزائن السنن: ۲/ ۲۰۲)

لہذا جب یہ قصہ الگ ثابت ہو گیا ہے، تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ اس میں تاویل کر کے اسے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی طریقے کے ساتھ ملا دیا جائے۔

چنانچہ ائمہ مجتہدین نے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیان کردہ غزوہ ذاتِ رِقاع کی نماز کو ایک الگ طریقہ اور صالح بن خوات کی بیان کردہ نماز کو ایک الگ طریقہ بتایا ہے، صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں ایک نماز تو نہیں پڑھی ہوگی، کسی نماز میں ایک طریقہ اپنایا اور کسی میں دوسرا، لہذا دونوں احادیث میں کوئی منافات نہ رہی، یہ دو الگ نمازیں ہیں۔

امام ابن حبان نے سیدنا جابر کی روایت کو چھٹے طریقے اور صالح بن خوات کی روایت کو نماز خوف کے ساتویں طریقے میں درج کیا ہے۔ (صحیح ابن حبان: ۷/ ۱۳۵-۱۴۰)

امام ابن خزیمہ نے بھی ان دونوں روایات سے دوا لگ الگ طریقے ثابت کئے ہیں۔

(صحیح ابن خزیمہ: ۲۹۷/۲، ۳۰۰)

امام ابن المنذر نے سیدنا جابر کی روایت چوتھے طریقے اور صالح بن خوات کی روایت چھٹے طریقے

میں بیان کی ہے۔ (الاوسط لابن المنذر: ۵/ ۳۲ - ۳۳)

امام بخاری نے بھی صالح بن خوات اور سیدنا جابر کی روایات الگ الگ ذکر کی ہیں۔

الغرض اس بحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دوا لگ واقعات ہیں۔

(۹) کشمیری صاحب کی یہ تاویل ایک اور وجہ سے بھی باطل ہو جائے گی کہ ابو داؤد اور نسائی کی

روایت میں ثمّ سلّم کے الفاظ موجود ہیں، یعنی آپ نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرا تھا، اگر بقول

کشمیری صاحب راوی نے آپ کی ایک رکعت کو دو سمجھ لیا ہو، تو کیا آپ نے ایک رکعت کے بعد سلام پھیرا

تھا؟ خود کشمیری صاحب اس اعتراض کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ويخدشه ما عند النسائي

(ص: ۲۳۲) من ذكر تسليم النبي صلى الله عليه وسلم أيضا بعد ركعتين. (میری اس تاویل کو دو

رکعتوں کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پھیرنا پورا کر دیتا ہے) (فیض الباری: ۴/ ۱۰۴)

تاویل نمبر ۳:

خود کشمیری صاحب نے اقرار کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پھیرنا، اس تاویل کو باطل کر

دیتا ہے، لیکن پھر بھی اپنی تاویل کو چھوڑ نہیں، بلکہ اسی کو ثابت کرنے کی خاطر ایک اور تاویل کر دی، بھلا

اقرار حدیث اور عمل بالحدیث اسی کا نام ہے؟ لکھتے ہیں:

قد انكشف عندنا حقيقة الأمر، وأن لا نتبع الألفاظ ونقول: انه بالحقيقة تسليم

القوم، ونسبت الى امامه لكونهم في امامته، لا أنه تسليم نفسه، أو يقال: انه لما انتظر

تسليم القوم، عبر الراوى انتظارا للتسليم بالتسليم.

”ہمارے ہاں حقیقت حال واضح ہو چکی ہے، ہم الفاظ کے پیچھے نہیں لگیں گے، بلکہ کہیں گے کہ در

حقیقت یہ قوم کا سلام تھا، امام ہونے کی وجہ سے آپ کی طرف منسوب کر دیا گیا، حقیقت میں آپ کا سلام

نہ تھا، یا یوں کہا جائے گا کہ جب آپ نے قوم کے سلام کا انتظار فرمایا، تو راوی نے انتظار کو سلام سمجھ لیا۔“

(فیض الباری: ۴/ ۱۰۴)

تبصرہ:

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ تقلیدنا سدید مقلدین کو کہاں تک لے جاتی ہے کہ ہر حدیث، جو ان کے امام کے قول کے خلاف آئے، اسے تاویلات کا تحتہ مشق بنا لیتے ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو بلا واسطہ شاگردانِ رسول ہیں، ان کے فہم پر حملے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دیکھیں کہ ائمہ کرام، محدثین عظام اور فقہائے کرام حتیٰ کہ بعض حنفی بزرگ بھی واشگاف الفاظ میں ان احادیث سے یہ مسئلہ ثابت کر رہے ہیں، لیکن مقلدین وہ باتیں کرتے ہیں، جو آج تک کسی نے نہیں کیں، کیا محدثین، ائمہ کرام اور اکابر احناف اس حدیث کو زیادہ جانتے تھے یا بعد کے اندھے مقلد؟ اگر یوں ہی تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے تو نماز خوف کے بہت سے طریقے، جو احناف کے ہاں بھی مقبول ہیں، باطل ہو جائیں گے، بلکہ سب طریقوں میں تاویل کر کے ایک ہی طریقہ بنا لیا جائے گا!!!

فائدہ :

کشمیری صاحب کی یہ ساری ”تاویلی محنت“ اس وقت رائیگاں ہو جائے گی، جب ہم امام طحاوی کا اس حدیث پر تبصرہ پیش کریں گے، وہ لکھتے ہیں:

فقد خالف القاسم یزید بن رومان، فان كان هذا يؤخذ من طريق الاسناد، فانَّ عبد الرَّحْمَنِ عن أبيه عن صالح بن خوات عن سهل بن أبي حثمة عن النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ مِنْ يَزِيدَ بْنِ رُومَانَ عَنْ صَالِحٍ عَمَّنْ أَخْبَرَهُ، وَأَنْ تَكَاثَفَا تَضَادًّا، وَإِذَا تَضَادَّا لَمْ يَكُنْ لِأَحَدِ الْخَصْمَيْنِ فِي أَحَدِهِمَا حُجَّةٌ إِذْ كَانَ لَخَصْمِهِ عَلَيْهِ مِثْلُ مَا لَهُ عَلَى خَصْمِهِ، فَانَّ قَالَ قَائِلٌ: فَانَّ يَحْيَى بْنَ سَعِيدٍ قَدْ رَوَى عَنْ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَاتٍ عَنْ سَهْلِ مَا يُوَافِقُ مَا رَوَى يَزِيدُ بْنُ رُومَانَ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ لَيْسَ بَدُونَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْقَاسِمِ فِي الضَّبْطِ وَالْحِفْظِ، قِيلَ لَهُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ كَمَا ذَكَرْتَ وَلَكِنْ لَمْ يَرْفَعْ الْحَدِيثَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَّمَا أَوْقَفَهُ عَلَى سَهْلٍ فَقَدْ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ مَا رَوَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ الْقَاسِمِ عَنْ صَالِحٍ هُوَ الَّذِي كَذَلِكَ كَانَ عِنْدَ سَهْلٍ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً ثُمَّ قَالَ هُوَ مِنْ رَأْيِهِ مَا بَقِيَ فَصَارَ ذَلِكَ رَأْيًا مِنْهُ لَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِذَلِكَ لَمْ يَرْفَعَهُ يَحْيَى إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا احْتَمَلَ ذَلِكَ مَا ذَكَرْنَا ارْتَفَعَ أَنْ يَقُومَ بِهِ حُجَّةٌ أَيْضًا....

”اس روایت میں قاسم نے یزید بن رومان کی مخالفت کی ہے، اگر سند کی طرف دیکھا جائے تو القاسم عن صالح... یزید بن رومان عن صالح... سے بہتر ہے، اگر یہ دونوں برابر بھی ہوں، تو ایک دوسرے کے معارض ہیں، اور جب معارض ہیں، تو دونوں گروہوں میں سے کسی کے لئے دلیل نہیں دن سکتیں۔۔۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یحییٰ بن سعید نے القاسم بن محمد عن صالح.... کی سند سے یزید بن رومان کی طرح ہی حدیث بیان کی ہے اور یحییٰ بن سعید عبدالرحمن بن قاسم سے ضبط و حفظ میں کم نہیں ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یحییٰ بن سعید، جیسا کہ آپ نے کہا ہے، کم درجہ نہیں ہیں، لیکن انہوں نے یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان نہیں کی، بلکہ موقوف ہے، جو عبدالرحمن بن قاسم نے بیان کیا ہے، وہ خاص آپ کے الفاظ ہوں اور جو یحییٰ بن سعید سے ہے، اس میں سہل نے اپنی رائے سے بات کی ہو، اسی لئے یحییٰ بن سعید اسے مرفوع بیان نہیں کرتے، جب ہمارا مذکورہ احتمال موجود ہے، تو اس سے دلیل لینا جائز نہ رہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عقلی طور پر بھی یہ درست نہیں، کیونکہ ہمیں کوئی نماز ایسی نظر نہیں آتی کہ اس میں مقتدی امام سے پہلے نماز کا کچھ حصہ ادا کر لے، بلکہ وہ یا تو امام کے ساتھ ادا کرتا ہے یا امام کے بعد، اختلافی صورت میں اجماعی امور کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔“

موصوف مزید لکھتے ہیں:

وَلَمَّا لَمْ نَجِدْ لِقَضَاءِ الْمَأْمُومِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَفْرَغَ الْإِمَامُ مِنَ الصَّلَاةِ أَصْلًا فِيمَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ يَدْلُ عَلَيْهِ فَنَعُظُهُ عَلَيْهِ أَبْطَلْنَا الْعَمَلَ بِهِ وَرَجَعْنَا إِلَى الْآثَارِ الْآخِرِ الَّتِي قَدَّمْنَا ذِكْرَهَا الَّتِي مَعَهَا التَّوَاتُرُ وَشَوَاهِدُ الْأَجْمَاعِ.

”جب ہمارے پاس امام کی فراغت سے پہلے مقتدی کی قضاء کے بارے میں کوئی اجماعی دلیل نہیں کہ ہم اس روایت کو اس پر محمول کر لیں، تو ہم نے اس پر عمل کو باطل قرار دے دیا، اور ان دوسرے آثار کی طرف رجوع کر لیا، جن کے ساتھ توواتر اور اجماعی تائید ہے، نیز ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بالکل برعکس طریقہ بھی بیان کیا ہے۔“

(شرح معانی الآثار للطحاوی: ۱/۲۷۸ - ۲۷۹)

اب کشمیری صاحب کے معتقدین ہی بتائیں کہ امام طحاوی حنفی کے مقابلے میں کشمیری صاحب کی کیا حیثیت ہے، بات طحاوی حنفی کی مانی جائے گی یا کشمیری صاحب کی؟ جس روایت کو بنیاد بنا کر کشمیری صاحب نے اتنی لمبی چوڑی تاویلات کی تھیں، امام طحاوی نے اسے ہی ناقابلِ حجت قرار دے دیا ہے،

احناف کو چاہئے کہ وہ اپنے اکابر کی تولا ج رکھیں۔

تاویل نمبر ۴:

جناب ابن ترکمانی حنفی لکھتے ہیں:

هذا كان في صلاة الخوف والنبى صلى الله عليه وسلم كان في مسافة لا تقصر في مثلها الصلوة. "آپ کی یہ نماز اتنی مسافت پر تھی کہ، اس جیسی مسافت پر نماز قصر نہیں کی جاتی۔"

(الجوهر النقي: ۸۶/۳) نیز دیکھیں (شرح معانی الآثار للطحاوی: ۱/ ۲۲۰)

تبصرہ :

(۱) جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: وحمله على حال الإقامة باطل .

"اس حدیث کو اقامت پر محمول کرنا باطل ہے۔" (فیض الباری: ۳/ ۲۴۷)

(ب) حافظ ابن حزم لکھتے ہیں:

هذا جهل وكذب آخر، أبو بكر متأخر الاسلام، لم يشهد بالمدينة قطّ خوفا ولا صلاة خوف ولا فيما يقرب منها، وإنما كان ذلك . قال جابر . بنخل و بذات الرقاع ، فكلما الموضعين على أزيد من ثلاثة أيام من المدينة .

"یہ ایک اور جھوٹ اور جہالت پر مبنی بات ہے، ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آخری دور میں اسلام لائے ہیں، انہوں نے مدینہ میں کبھی خوف، صلاۃ خوف یا اس سے ملتی جلتی کسی چیز کو نہیں دیکھا، بلکہ جابر کے بقول یہ نماز خوف نخل اور ذاتِ رقاع جگہ پر ادا کی گئی اور یہ دونوں جگہیں مدینہ سے تین دن سے زائد فاصلے پر واقع ہیں۔" (المحلی لابن حزم: ۴/ ۲۳۵)

چنانچہ صریح احادیث، اقوال ائمہ دین، فہم محدثین اور فقہات فقہائے کرام کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ تاویل فاسد و باطل ہے۔

حدیث کا ماننا مشکل کام ہے، تاویل مشکل نہیں، جو بھی باطل پر ہو بلا دلیل تاویل کر ہی لیتا ہے۔

علامہ ابن ابی العزہنی (م ۹۲ھ) العقیدۃ الطحاویہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولا يشاء مبطل أن يتأول النصوص و يحرفها عن مواضعها إلا وجد الى ذلك من السبيل. "کوئی بھی باطل پرست آدمی جب نصوص میں تاویل و تحریف پر اتر آتا ہے، تو تاویل کا کوئی نہ

کوئی راستہ اسے ضرور مل جاتا ہے۔" (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ۱۸۹)

نیز تاویل فاسد کے نقصانات کے تحت لکھتے ہیں:

وهذا الذى أفسد الدنيا والدين وهكذا فعلت اليهود والنصارى فى نصوص التوراة والانجيل وحذرنا الله أن نفعل مثلهم وأبى المبطلون ألا سلوك سبيلهم ، وكم جنى التأويل الفاسد على الدين وأهله من جناية ؟ فهل قتل عثمان رضى الله عنه ألا بالتأويل الفاسد ! وكذا ما جرى فى يوم الجمل ، و صفين ، ومقتل الحسين رضى الله عنه ، والحرّة ! وهل خرجت الخوارج ، واعتزلت المعتزلة ، ورفضت الرّوافض ، وافترقت الأمّة على ثلاث وسبعين فرقة ، ألا بالتأويل الفاسد .

”اسی (تاویل فاسد) نے دین و دنیا کو خراب کیا ہے، یہود و نصاریٰ توراة و انجیل کی نصوص کے ساتھ ایسا ہی تو کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچنے کا حکم دیا ہے، باطل پرست آج بھی انہی کے نقش قدم پر ڈٹے ہوئے ہیں، اس تاویل نے دین اور دین داروں پر کتنے ہی ظلم ڈھائے ہیں، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی تاویل فاسد کی وجہ سے ہی شہید کر دیئے گئے، جنگ جمل، صفین، سانحہ کربلا اور واقعہ حرہ اسی طرح رونما ہوئے، خوارج اہل السنہ سے اسی وجہ سے نکلے، معتزلی اسی وجہ سے علیحدہ ہوئے، روافضی اسی وجہ سے رافضی ہوئے اور امت اسی تاویل فاسد کی وجہ سے تہتر فرقوں میں بٹی۔“

(شرح العقیدہ الطحاویہ : ۱۸۹)

موصوف مزید لکھتے ہیں:

وأما اذا تأوّل الكلام بما لا يدلّ عليه ولا اقترن به ما يدلّ عليه ، فباخباره بأن هذا مراده كذب عليه ، وهو تأويل بالرّأى وتوهم بالهوى .

”جب کوئی کسی کلام کی ایسی تاویل کرے، جس پر یہ کلام دلالت ہی نہیں کرتی، نہ اس کا کوئی قرینہ ہو، تو اس تاویل کو، متکلم کی مراد قرار دینا، اس پر بہتان ہے، یہی من پسند تاویل اور نفسانی خواہش ہے۔“

(شرح العقیدہ الطحاویہ : ۱۹۸)

کیا صحیح احادیث، فہم محدثین اور اقوال فقہاء کے خلاف یہ تاویل، صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان اور اتباع ہوی نہیں ہے؟

اب ایک طرف امام طحاوی حنفی اس روایت کو اجماع و قوا تر کے خلاف قرار دے کر، اس پر عمل کو باطل کہہ رہے ہیں، جبکہ اس کے بالکل برعکس کشمیری صاحب بخاری و مسلم کی صحیح و صریح روایت کو اس پر

محمول کرنے کے لئے تاویلیں کر رہے ہیں۔

قارئین! انصاف شرط ہے، بتائیں کہ فقہ حنفی میں امام طحاویؒ کی بات مانی جائے گی یا کشمیری صاحب کی، کوئی مجتہد اس پر مواخذہ کرے، تو کرے، ایک مقلد کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے مجتہد امام کی مخالفت کرے؟ کیا یہ تضاد بیانی نہیں ہے؟

تاویل نمبر 5:

وَأَنَّ قِصْرَ الصَّلَاةِ أَمْرٌ هُوَ اللَّهُ تَعَالَى بِهِ بَعْدَ ذَلِكَ فَكَانَتْ الْأَرْبَعُ يَوْمًا مَفْرُوضَةً عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .

”آپ کو نماز میں قصر کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے بعد دیا تھا، اس دن یہ چار رکعتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھیں اور یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے۔“

(شرح معانی الآثار للطحاوی: ۲۲۷/۱)

تبصرہ:

امام طحاویؒ کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ غزوہ ذات رقاہ بالاتفاق کم از کم بھی ۳ ہجری میں پیش آیا، اور نماز قصر ہجرت کے فوراً بعد نازل ہو گئی تھی۔
حافظ ابن حزم لکھتے ہیں:

وقد صحَّ عن عائشة رضي الله عنها أَنَّ الصَّلَاةَ أُنْزِلَتْ بِمَكَّةَ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ ، فَلَمَّا هَاجَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَمَّتْ صَلَاةَ الْحَضَرِّ وَأَقْرَتْ صَلَاةَ السَّفَرِ .

”عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے با سند صحیح ثابت ہے کہ مکہ میں نماز دو دو رکعت نازل ہوئی تھی، جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، تو حضر کی نماز مکمل ہو گئی اور سفر کی دو ہی برقرار رکھی گئی۔“

(صحیح بخاری: ۱۰۹۰، صحیح مسلم: ۶۸۵، المحلی لابن حزم: ۴/۲۳۵)

نیز لکھتے ہیں:

فهذا آخر فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم ، لأن أبا بكره شهده ، وأما كان اسلامه يوم الطائف بعد فتح مكة وبعد حنين .

”یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل مبارک ہے، کیونکہ سیدنا ابو بکرؓ اس میں حاضر ہوئے ہیں اور وہ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد طائف والے دن مسلمان ہو رہے ہیں۔“ (المحلی: ۴/۲۳۷)

تاویل نمبر ۶:

امام طحاوی حنفی لکھتے ہیں:

قد یحتمل أن يكون ذلك السلام المذكور في هذا الموضع هو سلام التشهد الذي لا يراد به قطع الصلوة، ويحتمل أن يكون سلاما اراد به اعلام الطائفة الأولى بأوان انصرافها والكلام حينئذ مباح له في الصلاة غير قاطع لها.

”یہ بھی احتمال ہے کہ اس حدیث میں دو رکعتوں کے بعد آپ کا مذکورہ سلام، تشہد والا سلام ہو، جس سے نماز سے خارج ہونا مراد نہ ہو، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ اس سلام سے پہلی جماعت کو جانے کی خبر کرنا مقصود ہو، ان دنوں نماز میں کلام جائز تھی، نماز کو توڑتی نہ تھی۔“ (شرح معانی الآثار للطحاوی: ۲۷۱)

تبصرہ:

ہم پیچھے ثابت کر آئے ہیں کہ صلاۃ خوف کا واقعہ نماز قصر نازل ہونے کے بہت مدّت بعد کا ہے۔ حافظ نووی لکھتے ہیں:

و ادعى الطحاوی أنه منسوخ ولا تقبل دعواه اذ لا دليل لنسخه .

”امام طحاوی نے اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن ان کا یہ دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نسخ کی کوئی دلیل موجود نہیں۔“ (شرح مسلم از نووی: ۲۷۸/۱)

لہذا اگر یہاں سلام سے سلام تشہد (التحیات میں السلام علیک اور السلام علینا) مراد لیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قصر میں چار رکعت نماز ثابت ہوگی، اور احناف کے نزدیک قصر میں چار رکعت یا تو باطل ہے یا اس میں آخری دو نفل ہیں۔

حافظ ابن حزم لکھتے ہیں:

وأبو حنيفة يرى على من صلى أربعا وهو مسافر أن صلاته فاسدة، ألا أن يجلس في الاثنتين مقدار التشهد فتصح صلاته، وتكون الركعتان اللتان يقوم اليهما تطوعا، فان كان عليه السلام لم يقعد بين الركعتين مقدار التشهد فصلاته عندهم فاسدة، فان أقدموا على هذا القول كُفِّروا بلا مرية، وان كان عليه السلام قعد بين الركعتين مقدار التشهد فقد صارت الطائفة الثانية مصلية فرضهم خلفه، وهو عليه السلام متنفل، وهذا قولنا لا قولهم .

”امام ابو حنیفہ کا خیال ہے کہ جو آدمی سفر میں چار رکعتیں پڑھے، اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، ہاں

اگر وہ دو رکعتوں کے بعد تشهد میں بیٹھ گیا، تو اس کی نماز درست ہو جائے گی، لیکن دوسری دو رکعتیں نفل شمار ہوں گی، لہذا اگر آپ دو رکعتوں کے بعد تشهد میں نہیں بیٹھے، تو احناف کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نعوذ باللہ فاسد ہوگی، اگر یہ بات کہہ دیں تو بلاشبہ کا فر قرار پائیں گے، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نزدیک دو رکعتوں کے بعد بیٹھے تھے، تو پھر دوسرے گروہ نے آپ کے نفلوں کی اقتداء میں فرض ادا کئے، اس طرح یہ ہماری دلیل بنی نہ کہ ان کی۔“ (المحلی لابن حزم: ۴/۲۲۸)

علامہ زیلعی حنفی لکھتے ہیں:

وعلى كل حال، فلا استدلال على الحنفية بحديث جابر صحيح، وان لم يسلم من الركعتين، لأن فرض المسافر عندهم ركعتان، والقصر عزيمة، فان صلى المسافر أربعاً وقعد في الأولى صحت صلاته، وكانت الأخرى له نافلة.

”جو بھی تاویل کی جائے، ہر حال میں جابر کی حدیث سے احناف کے خلاف (متنفل کی اقتداء میں مفترض کی نماز کا) استدلال درست ہے، اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں کے بعد سلام نہ بھی پھیرا ہو کیونکہ احناف کے ہاں مسافر پر دو رکعتیں فرض ہیں اور قصر کرنا عزمیت (واجب) ہے، اگر مسافر چار رکعتیں پڑھے اور دو کے بعد بیٹھ جائے، تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی، لیکن آخری دو رکعتیں نفل ہوں گی، فرض نہیں ہو سکتیں، کیونکہ چار فرض پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔“ (نصب الراية: ۵۷/۲)

تاویل نمبر ۷: جناب ابن ترکمانی حنفی لکھتے ہیں:

وهذا الحديث اضطرب فيه الحسن فرواه مرة عن جابر ومرة عن أبي بكر، ثم أخرجه البيهقي من حديث أبي بكر وليس فيه أنه سلم بعد الركعتين الأوليين.

”اس حدیث میں حسن بصری کی طرف سے اضطراب واقع ہو گیا ہے، وہ کبھی اسے جابر سے اور کبھی ابو بکرہ سے بیان کرتے ہیں، پھر بیہقی نے ابو بکرہ کی جو حدیث بیان کی ہے، اس میں دو رکعتوں کے بعد سلام مذکور نہیں۔“ (الجوهر النقي: ۸۶/۳)

تبصرہ :

- (۱) اضطراب کا دعویٰ فضول ہے، کیونکہ ابو بکرہ اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں اس نماز میں حاضر ہوئے تھے، حسن بصری نے دونوں سے یہ واقعہ نقل کر دیا ہے، اضطراب کیسا؟
- (۲) امام طحاوی حنفی تو بالاتفاق قرن حدیث میں ابن ترکمانی حنفی سے فائق ہیں، انہوں نے اس

حدیث پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں، جن کے جواب گزر چکے ہیں، لیکن یہ اعتراض امام طحاوی نے بھی نہیں کیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک بھی اس حدیث میں یہ علت نہیں۔

(ج) علامہ زیلعی حنفی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: أخرجه أبو داود بسند صحيح .

”امام ابوداؤد نے اس حدیث کو باسند صحیح بیان کیا ہے۔“ (نصب الراية: ۲/۲۴۶)

لہذا اضطراب نہ رہا، رہی یہ بات کہ سنن کبریٰ بیہقی میں سیدنا ابوبکرہ کی روایت میں اس سلام کا ذکر نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو بیان کرنے والا ایک راوی ان سے یہ الفاظ بیان نہیں کرتا، دوسرا کر دیتا ہے، تو ائمہ احناف کی تصریح کے مطابق اس صحیح حدیث کے ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہونی چاہیے۔

علامہ زیلعی حنفی سیدنا ابوبکرہ کی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

واعلم أن هذا الحديث صريح أنه عليه الصلاة والسلام سلم من الركعتين .

”جان لیں کہ ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث اس بات میں صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرا تھا۔“ (نصب الراية: ۲/۲۴۶)

دلیل نمبر ۴:

سید الملائکہ جبریل امین علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ نمازوں میں امامت کی

ہے۔ (صحیح بخاری: ۴۹۹، صحیح مسلم: ۶۱۰-۶۱۱)

اتفاقی بات ہے کہ جبریل امین پر نماز فرض نہیں، کیونکہ وہ شریعت محمدیہ کے مکلف نہیں ہیں اور غیر مکلف بچے وغیرہ کی نماز نفل ہوتی ہے، لہذا جبریل کی یہ نماز نفل تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی فرض نمازیں ان کی اقتداء میں ادا کیں، ثابت ہوا کہ متقی کی اقتداء میں مفترض کی نماز ہو جاتی ہے، یہ ایسی دلیل ہے جس کا مقلدین کے پاس کوئی جواب نہیں۔

دوسرے بہت سے مسائل کی طرح دنیاۓ حقیقت اس مسئلہ میں بھی دلائل سے بالکل تہی دست ہے، ہمارے ذکر کردہ صریح و صحیح حدیثی دلائل کے برعکس ان کے پاس ایک بھی دلیل ایسی نہیں جس سے متقی کی اقتداء میں مفترض کی نماز کا بطلان ظاہر ہوتا ہو، آئندہ قسط میں ان کے مزعومہ دلائل کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

جاری ہے....

قربانی کے احکام و مسائل:

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

ذوالحجہ کے عالی شان ایام :

اسلامی کیلنڈر کے آخری مہینے ذوالحجہ کے پہلے دس دن انتہائی بابرکت اور حرمت والے ہیں، ان ایام میں کیے جانے والے نیک اعمال دوسرے دنوں میں کیے گئے اعمالِ صالحہ پر فوقیت و فضیلت رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دوسرے دنوں کی بہ نسبت ان دنوں میں کیا جانے والا نیک عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہوتا ہے، صحابہ کرام نے عرض کی، دوسرے دنوں میں کیا جانے والا جہاد بھی ان دنوں کے عمل سے افضل نہیں؟ فرمایا، جہاد بھی نہیں، ہاں! اگر کوئی آدمی اپنا جان و مال لے کر اللہ کے راستے میں نکلتا ہے اور کچھ واپس نہیں

آتا۔“ (صحیح بخاری: ۹۶۹، سنن ابی داؤد: ۲۴۳۸، جامع ترمذی: ۷۵۷، سنن ابن ماجہ: ۱۷۲۷)

سیدنا ابوقحادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”عرفہ کے دن (۹ ذوالحجہ کا) روزہ گزشتہ اور آئندہ دو سالوں کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔“

(صحیح مسلم: ۱۱۶۲)

الحاصل ان مبارک دنوں میں نفلی نماز، نفلی روزوں، صدقہ و خیرات، ذکر واذکار، تکبیر و تہلیل اور دیگر نیک اعمال کا اہتمام مولائے رحمن و رحیم کی بے پایاں رحمت اور لائتا ہی مغفرت کا باعث ہے۔ ان دنوں میں کیے جانے والے مبارک اعمال میں سے ایک عالی مرتبت و عالی مقام عمل ”قربانی“ بھی ہے، جو کہ اسلام کا باکمال اور ممتاز شعار ہے۔

قربانی

دس ذوالحجہ کے بابرکت دن کا پر امن سورج پیغامِ مسرت لے کر مسکراہٹوں کی کرنیں بکھیرتا ہوا طلوع ہوا، دو رکعت نمازِ عید الاضحیٰ کی ادائیگی اور خطبہ عید سننے کے بعد فرزندانِ امتِ مسلمہ گھروں میں پہنچے، عید الفطر کی طرح محوِ استراحت نہ ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے رزق میں سے اونٹ، گائے، بکری یا بھیڑ، دنبے کا انتخاب کیا، اس کی لگام کو تھاما، عاجزی و فروتنی اور اللہ و رسول کی اطاعت و

فرمانبرداری کے جذبات سے سرشار ہو کر مخصوص مقام پر پہنچ کر جانور کو لٹایا اور ”بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ“ کا نعرہ لگا کر جانور کو اللہ رب العزت کے نام پر ذبح کر کے سنت کو دوام بخشا، اس عمل کی بنیاد خورد و نوش، نمود و نمائش اور ریا کاری نہیں، بلکہ امت مسلمہ کا شعار اسلام کے ساتھ لگاؤ اور اللہ و رسول کے ساتھ گہری محبت کا نتیجہ ہے۔

قربانی کا حکم :

ذوالحجہ کے ایام قربانی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مخصوص شرائط کے حامل جانوروں کا خون بہانا شعار اسلام اور عظیم عبادت ہے، جسے قربانی کہا جاتا ہے، یہ سنت ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من كان له سعة فلم يضح فلا يقربن مصلانا.

”جو شخص استطاعت و قدرت کے باوجود قربانی نہیں کرتا، وہ ہماری عید گاہوں کے قریب تک نہ

پہنچے۔“ (مسند احمد: ۲/۳۲۷، سنن ابن ماجہ: ۳۱۲۳، واللفظ له، المستدرک للحاکم: ۲/۴۰۳۹، سنن ترمذی: ۲۳۲۰/۲۳۲۱، وسندہ حسن)

اس حدیث کی سند کو امام حاکم نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

اس کا راوی عبد اللہ بن عیاش القصبانی جمہور کے نزدیک ”موثق، حسن الحدیث“ ہے، حافظ ذہبی

لکھتے ہیں: حدیثہ فی عداد الحسن۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳۳۴/۷)

واضح رہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس خدشہ کے پیش

نظر قربانی چھوڑنا ثابت ہے کہ کہیں لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۶۵/۹، وسندہ صحیح)

سیدنا ابوسعود بدری انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں:

لقد هممت ان ادع الاضحیۃ وانی لمن ایسر کم بها، مخافة ان يحسب انها حتم واجب.

”میں تو قربانی ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہوں، اس ڈر سے کہ اسے حتمی اور واجب نہ سمجھ لیا جائے،

حالانکہ میں تم سب سے بڑھ کر آسانی سے قربانی کر سکتا ہوں۔“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۶۵/۹، وسندہ صحیح)

حافظ ابن حجر نے اس اثر کی سند کو ”صحیح“ کہا ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۶۵/۹، وسندہ صحیح) اور سیدنا بلال

رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المحلی لابن حزم: ۳۵۸/۷، وسندہ صحیح) کے وجوب کے قائل نہیں تھے۔

زیاد بن عبد الرحمن کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قربانی کے بارے

میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا، یہ سنت اور کار خیر ہے۔ (صحیح بخاری: ۸۳۲/۲، تعلیقاً، تغلیقاً، ۲/۵، وسندہ صحیح)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے موصولاً ذکر کر کے اس کی سند کو ”جید“ قرار دیا ہے۔
امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری اور دیگر محدثین عظام کے نزدیک بھی قربانی سنت ہے۔
امام ابوحنیفہ سے باسنَد صحیح قربانی کو واجب قرار دینا ثابت نہیں ہے، مدعی پر دلیل لازم ہے۔

قربانی کے جانور کی عمر :

قربانی کے جانور کے لیے دو نڈا ہونا شرط ہے، جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تذبحوا الا مسنة الا أن يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضان.

”تم دو نڈا جانور ہی ذبح کرو، اگر تنگی واقع ہو جائے تو بھیڑ کی نسل سے جذعہ ذبح کر لو۔“

(صحیح مسلم: ۱۵۵/۲، ح: ۱۹۶۳)

حافظ نووی کہتے ہیں کہ علمائے کرام کا کہنا ہے کہ ”مُسْنَةُ“ اس اونٹ یا گائے اور بکری وغیرہ کو کہتے ہیں، جو دو نڈا ہو، نیز اس حدیث میں یہ وضاحت ہو گئی ہے کہ بھیڑ کی جنس کے علاوہ کسی اور جنس کا ”جَذْعَةُ“ جائز نہیں، قاضی عیاض کے بقول اس پر اجماع ہے۔ (شرح مسلم للنووی: ۱۵۵/۲)

امام ترمذی فرماتے ہیں: وقد أجمع أهل العلم أن لا يجوز الجذع من المعز، وقالوا: إنما يجوز الجذع من الضان.

”اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ بکری کی جنس کا ”جذعہ“ قربانی میں کفایت نہیں کرتا، جبکہ بھیڑ کی جنس کا ”جَذْعَةُ“ کفایت کرتا ہے۔“ (جامع ترمذی تحت حدیث: ۱۵۰۸)

یاد رہے کہ ”جَذْعَةُ“ کی عمر میں اختلاف ہے، جمہور ایک سال کے قائل ہیں اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے، حافظ نووی لکھتے ہیں:

والجذع من الضأن ما له سنة تامة، هذا هو الأصح عند أصحابنا، وهو الأشهر عند أهل اللغة وغيرهم.

بھیڑ کی جنس کا ”جَذْعَةُ“ مکمل ایک سال کا ہوتا ہے، ہمارے اصحاب کے نزدیک یہی صحیح تر بات ہے، نیز یہی اہل لغت وغیرہ کے ہاں مشہور قول ہے۔“ (شرح مسلم للنووی: ۱۵۵/۲)

اس حدیث میں مذکورہ حکم عام ہے، ہر جانور کو شامل ہے، وہ بکری کی جنس ہو یا بھیڑ کی، گائے کی جنس ہو یا اونٹ کی، ان سب کا دو نڈا ہونا ضروری ہے، وہ صحیح احادیث جن سے بھیڑ کے ”جَذْعَةُ“ کی

قربانی کا جواز ملتا ہے، وہ تنگی پر محمول ہیں، یعنی دونوں جانور نہ ملے تو ایک سال کا دنبہ یا بھیڑ ذبح کی جاسکتی ہے، اس طرح تمام احادیث پر عمل ہو جائے گا۔

تنگی کی دو صورتیں ممکن ہیں، ایک دوندے جانور کا دستیاب نہ ہونا اور دوسرے ایسے جانور کو خریدنے کی طاقت نہ ہونا، ایسی صورت میں بھیڑ کا یعنی ”جَذَعَة“ ایک سال کا دنبہ ذبح کیا جائے گا۔

تنبیہ : بعض نا عاقبت اندیش لوگ جانور کو دوندہ بنا کر روانے کے لیے سامنے والے دانت توڑ دیتے ہیں، یہ محض دھوکا اور فریب ہے، ایسے جانور کی قربانی درست نہیں۔

جانور کی قربانی میں شراکت:

بکرا، بکری، دنبہ اور بھیڑ میں سے ہر ایک جانور صرف ایک آدمی کو کفایت کرتا ہے، ہاں ایک بکرا یا دنبہ تمام اہل خانہ کے لیے کافی ہے، دلائل ملاحظہ ہوں:

☆۱ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنبے کی قربانی کی اور فرمایا:

بِسْمِ اللَّهِ، اللَّهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ .

”اللہ کے نام کے ساتھ (ذبح کرتا ہوں)، اے اللہ! (یہ قربانی) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آل محمد

اور امت محمدیہ کی طرف سے قبول فرما۔“ (صحیح مسلم: ۱۵۶/۲، ح: ۱۹۶۷)

اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہوا کہ ایک دنبہ تمام اہل خانہ کی طرف سے ذبح کیا جاسکتا ہے، سب کی طرف سے قربانی ادا ہو جائے گی، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دنبہ اپنی طرف سے، اپنی آل کی طرف سے اور اپنی امت کی طرف سے ذبح کیا۔

واضح رہے کہ جب حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے جانے والے حجاج کرام منیٰ میں قربانی کریں گے تو ان کے گھر کے بقیہ افراد اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

فائدہ: امت کی طرف سے قربانی کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔

☆۲ عطاء بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں، میں نے سیدنا ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا:

کیف كانت الصّحاحيا فيكم على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ؟

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں تمہاری قربانیاں کیسی ہوتی تھیں؟“

تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

كان الرَّجُل في عهد النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَى بِالشَّاةِ عَنْهُ وَعَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ
فِيَاكُلُونَ وَيَطْعَمُونَ ، ثُمَّ تَبَاهَى النَّاسَ فَصَارَ كَمَا تَرَى .

”آدمی عہد نبوی میں ایک بکری کی قربانی اپنی طرف سے اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے کرتا تھا،
وہ خود بھی گوشت کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے، بعد ازاں لوگ (قربانی کرنے میں) باہم فخر و مباہات
کرنے لگ گئے، جن کی (ناگفتہ بہ) حالت آپ کے سامنے ہے۔“

(موطا امام مالک بروایۃ یحییٰ ۲/ ۴۸۶، جامع ترمذی: ۱۵۰۵، سنن ابن ماجہ: ۳۱۴۷ واللفظ لہ السنن الکبریٰ

للبيهقي: ۲۶۸/۹، وسنده صحيح) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ”حسن صحیح“ کہا ہے۔

☆۳ عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:

كان رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَى بِالشَّاةِ الواحدة عن جميع أهله .
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے ایک بکری قربانی کرتے تھے۔“

(المستدرک للحاکم: ۳/ ۴۵۶، ۴/ ۲۲۹ واللفظ لہ السنن الکبریٰ للبيهقي: ۹/ ۲۶۸ الآحاد

والمثنائي لاحمد بن عمرو: ۶۷۹، وسنده صحيح)

امام حاکم نے اس حدیث کو ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

☆۴ ابوسریحہ الغفاری حدیفہ بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے
زیادتی پر اکسایا، بعد اس کے کہ میں نے سنت کو جان لیا تھا کہ اہل خانہ ایک یا دو بکریاں قربانی کے لیے ذبح
کرتے تھے، (اب ہم ایسا کریں) تو ہمارے پڑوسی ہمیں کنجوس کہتے ہیں۔“

(سنن ابن ماجہ: ۳۱۴۸ واللفظ لہ المستدرک للحاکم: ۴/ ۲۲۸ السنن الکبریٰ للبيهقي: ۹/ ۲۶۹ شرح

معاني الآثار للطحاوي: ۴/ ۱۷۴ المعجم الكبير للطبراني: ۳۰۵۶، ۳۰۵۷، ۳۰۵۸، وسنده صحيح)

اس حدیث کی سند کو امام حاکم نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، علامہ
سندی حنفی لکھتے ہیں: اسنادہ صحیح و رجالہ موثقون۔

”اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راویوں کی توثیق بیان کی گئی ہے۔“ (حاشیۃ السندی علی ابن ماجہ)

اونٹ میں شراکت:

ایک اونٹ میں دس حصہ دار شریک ہو سکتے ہیں، جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے
روایت ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک اونٹ میں دس

اور ایک گائے میں سات آدمی شریک ہوئے۔

(مسند الامام احمد: ۲۴۸۸، السنن الكبرى للنسائی: ۴۱۲۳، ۴۳۹۲، ۴۴۸۲، جامع ترمذی:

۹۰۵، سنن ابن ماجہ: ۳۱۳۱، المستدرک للحاکم: ۴/ ۰۲۳۰، السنن الكبرى للبيهقي: مشکل الآثار للطحاوی: ۳/ ۰۲۴۵،

شرح السنۃ للبیہقی: ۱۱۳۲، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ترمذی نے ”حسن غریب“ امام ابن حبان (۳۰۷) نے ”صحیح“ اور امام حاکم نے ”صحیح علی شرط البخاری“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ اونٹ میں دس آدمی حصہ ڈال سکتے ہیں، اس کے تعارض میں ایک روایت ہے، سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ ہم حدیبیہ والے سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربانی کی، ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کیا اور ایک گائے بھی سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کی گئی۔ (صحیح مسلم: ۱/ ۰۴۲۴، ح: ۱۳۱۸)

اس حدیث کو ”ہدی“ (منی میں جانے والی قربانی) پر محمول کریں تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے مخالفت ختم ہو جاتی ہے، یعنی منی میں حجاج کرام ایک اونٹ میں سات آدمی شریک ہوں گے، جبکہ دیگر لوگ ایک اونٹ کو دس آدمیوں کی طرف سے ذبح کر سکتے ہیں۔

جانور کے عیوب:

قربانی کا جانور درج ذیل عیوب و نقائص سے سالم ہونا چاہیے:

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أربع لا تجوز فی الأضاحی: العوراء بین عورها، والمریضة بین مرضها، والعرجاء بین ظلعها، والكبیر التي لا تنقی.

”چار قسم کے جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں: (۱) کانٹا جانور، جس کا کانپن ظاہر ہو، (۲) بیمار جانور، جس کی بیماری ظاہر ہو، (۳) لنگڑا جانور، جس کا لنگڑاپن ظاہر ہو اور (۴) شکستہ ولاغر جانور، جس کی ہڈیوں

میں گودانہ ہو۔“ (مسند احمد ۴/ ۸۴، سنن ابی داؤد: ۲۸۰۲، سنن الترمذی: ۴۳۷۴، جامع ترمذی: ۱۴۹۷، سنن ابن

ماجہ: ۳۱۴۴، وسندہ صحیح)

اس حدیث کو امام ترمذی، امام ابن خزیمرہ (۲۹۱۲)، امام ابن حبان (۵۹۱۹، ۵۹۲۲)، امام ابن الجارود (۴۸۱) اور امام حاکم (۱/ ۴۶۷-۴۶۸) نے ”صحیح“ کہا ہے، حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ جانور خریدنے کے بعد ان عیوب میں سے کوئی عیب پیدا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

ان کان أصابها بعد ما اشتريتموها فامضوها وان كان أصابها قبل أن تشتروها فأبدلوها
 ”اگر خریدنے کے بعد عیب پیدا ہو تو قربانی کر دو، لیکن اگر عیب پہلے سے موجود ہو تو اسے بدل لو۔“
 (السنن الکبری للبیہقی: ۲۸۹/۹، وسندہ صحیح)

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إذا اشتري رجل أضحیة فمرست عنده أو عرض لها مرض فهی جائزة .

”جب آدمی قربانی کا جانور خرید لے، پھر بعد میں وہ بیمار ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے۔“

(مصنف عبدالرزاق: ۳۸۶/۴، ح: ۸۱۶۱، وسندہ صحیح)

سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (قربانی کے) جانور کی آنکھیں اور کان بغور دیکھنے کا حکم دیا۔

(مسند الامام احمد: ۱/ ۱۰۵، سنن النسائی: ۷/ ۲۱۳، ح: ۴۳۸۱)

سنن ترمذی: ۱۵۰۳، سنن ابن ماجہ: ۳۱۴۳، وسندہ حسن)

اس کو امام ترمذی نے ”حسن صحیح“ اور امام ابن خزیمہ (۲۹۱۴) اور امام حاکم نے ”صحیح“ کہا ہے۔

یہ حکم واجب نہیں، بلکہ ندب و ارشاد پر محمول ہے۔

نیز سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کان کٹے ہوئے اور سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی سے منع فرمایا۔

(سنن ابی داؤد: ۲۸۵۰، سنن نسائی: ۴۳۸۲، سنن ترمذی: ۱۵۰۳، سنن ابن ماجہ: ۳۱۴۵، وسندہ حسن)

امام ترمذی نے اس کو ”حسن صحیح“ کہا ہے، نسائی وغیرہ میں شعبہ نے قتادہ سے بیان کیا ہے۔

یادرہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں، بلکہ تنزیہی ہے، کان اور سینگوں میں تھوڑا بہت نقص مضر نہیں۔

تنبیہ:

قربانی کے جانور کا خسی ہونا عیب نہیں ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دو خسی مینڈھوں

کی قربانی کی ہے۔ (مسند الامام احمد: ۳۷۵/۳، سنن ابی داؤد: ۲۷۹۵، سنن ابن ماجہ: ۳۱۲۱، وسندہ حسن)

امام ابن خزیمہ (۲۸۹۹) نے اس حدیث کو ”صحیح“ کہا ہے، ابن اسحاق نے سماع کی تصریح کر رکھی

ہے اور ابن خزیمہ نے راوی ابو عیاش کی توثیق کی ہے، ایک جماعت نے اس سے روایت کی ہے۔

پیدائشی طور پر سینگوں کا نہ اگنا قطعی طور پر عیب نہیں۔

متفرق احکام:

..... قربانی کا ارادہ رکھنے والے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے سے لے کر قربانی کرنے تک نہ اپنے بال کاٹے اور نہ ناخن تراشے۔ (صحیح مسلم: ۱۶۲/۲، ح: ۱۹۷۷)

..... یاد رہے کہ جس آدمی کو قربانی کرنے کی استطاعت نہ ہو، لیکن وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے سے پہلے سر کے بال اور مونچھیں کاٹ لیتا ہے، ناخن تراش لیتا ہے اور دوسری ضروری صفائی کر لیتا ہے اور پھر قربانی تک اس سے پرہیز کرتا ہے، تو اسے قربانی کا پورا اجر و ثواب ملے گا۔

(مسند الامام احمد: ۱۶۹/۲، سنن ابی داؤد: ۲۷۸۹، سنن نسائی: ۴۳۶۵، وسند حسن)

امام ابن حبان (۵۹۱۴)، امام حاکم (۲۳۳/۴)، اور حافظ ذہبی نے اس حدیث کو ”صحیح“ کہا ہے۔

..... قربانی کی استطاعت کے لیے زکوٰۃ کے نصاب کی شرط لگانا بے بنیاد ہے، ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اپنی صورت حال کو سامنے رکھ کر قربانی کی استطاعت کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے۔

..... بیک وقت ایک آدمی ایک سے زائد قربانیاں کر سکتا ہے۔

..... قربانی کرتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے: بِسْمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ (صحیح مسلم: ۱۹۶۶) اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ وَمِنْ اَهْلِيْ۔ (صحیح مسلم: ۱۹۶۷، استدلالاً)

”اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ (ذبح کرتا ہوں) اور اللہ سب سے بڑا ہے، اے اللہ! (یہ قربانی) میری طرف سے اور میرے اہل کی طرف سے قبول فرما۔“

..... عورت اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کر سکتی ہے، خواہ ایام مخصوصہ ہی کیوں نہ ہوں۔

..... قربانی کے جانور کا گوشت، سری پائے اور کھال یا چیز وغیرہ قصاب کو بطور اجرت دینا ممنوع ہے، قصاب کو اپنی جیب سے اجرت دی جائے۔

..... قربانی کے گوشت میں مساکین و فقراء کا حق ہے، جو انہیں ملنا چاہیے، اس حق کی مقدار مقرر نہیں، بقیہ گوشت جو ذخیرہ کیا جاسکتا ہے۔ (صحیح بخاری: ۵۵۶۹)

..... قربانی کی کھال کا وہی مصرف ہے، جو اس کے گوشت کا ہے، لہذا وہ کھال کسی حق دار (مسکین و محتاج) کو دی جاسکتی ہے۔ (صحیح بخاری: ۱۷۱۷، صحیح مسلم: ۱۳۱۷)

یا اپنے ذاتی استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔ (صحیح مسلم: ۱۹۷۱)

یاد رہے کہ قربانی کے جانور کا کوئی حصہ نہ فروخت کیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی ذاتی خدمت کے عوض کسی کو

دیا جاسکتا ہے اور اگر کھال فروخت کرنا پڑے تو اس کی قیمت مساکین و فقراء کو دے دی جائے۔

..... ایک آدمی نے قربانی کی نیت سے جانور پالا ہوا تھا، وہ وقت سے پہلے مر گیا، گم ہو گیا یا وہ وقت پر دندا نہیں ہوا تو اس صورت میں اگر اس کو دوسرا جانور قربانی کرنے کی استطاعت ہے تو ٹھیک، ورنہ وہ قربانی نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار؟

..... ذبح کے وقت بہنے والا خون حرام ہے، اس کے علاوہ حلال جانور کے تمام اعضاء حلال ہیں، جبکہ خفیوں، دیوبندیوں کے نزدیک حلال جانور میں سات چیزیں حرام ہیں، جس روایت کو دلیل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ انقطاع کی وجہ سے ”ضعیف“ اور ناقابلِ حجت ہے۔

..... میت کی طرف سے قربانی کرنا ثابت نہیں، اگر کوئی ایسا عمل کرتا ہے تو وہ صدقہ ہوگا نہ کہ قربانی، نیز اس کا سارا گوشت تقسیم کر دیا جائے گا۔

..... اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ (صحیح مسلم: ۳۶۰)

یوم عرفہ (نو ذوالحجہ) سے ایام تشریق کے آخر تک تکبیرات:

یوم عرفہ (نوذوالحجہ) کی نماز فجر سے لے کر تیرہویں ذوالحجہ کی شام تک فرضی نمازوں کے دیگر اذکار کے ساتھ یہ تکبیرات بھی پڑھنی چاہئیں، ان دنوں کے عام اوقات میں بھی یہ تکبیرات پڑھیں۔

امام ابراہیم رحمہ فرماتے ہیں کہ مسلمان نوذوالحجہ کو فرض نماز کے بعد قبلہ کی طرف منہ کر کے یہ تکبیرات پڑھتے تھے: اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، واللہ الحمد۔

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے، تعریف و ثناء بھی اسی ہی کی ہے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۷/۲، وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نوذوالحجہ کی نماز فجر سے لے کر تیرہویں ذوالحجہ کی شام تک یہ تکبیرات پڑھتے تھے: اللہ اکبر کبیراً، اللہ اکبر کبیراً، اللہ اکبر وأجل، اللہ اکبر واللہ الحمد۔

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، وہ انتہائی عظمت والا ہے، وہ سب سے بڑا ہے، تعریف بھی اسی ہی کی ہے۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۷/۲، وسندہ صحیح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ الفاظ بھی ثابت ہیں:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، واللہ الحمد، اللہ اکبر وأجل، اللہ اکبر علی ما ہدانا۔

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اسی کی تعریف ہے، اللہ سب

سے بڑا ہے، وہ انتہائی عظمت والا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اس وجہ سے کہ اس نے ہمیں ہدایت دی۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳۱۵/۳، وسندہ صحیح)

ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیں تکبیرات کے کلمات سکھاتے تھے، کہتے تھے کہ ان کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو:

اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا ، اللَّهُمَّ أَنْتَ أَعْلَى وَأَجَلُّ مِنْ أَنْ تَكُونَ لَكَ صَاحِبَةٌ أَوْ يَكُونَ لَكَ وَلَدٌ أَوْ يَكُونَ لَكَ شَرِيكَ فِي الْمُلْكِ أَوْ يَكُونَ لَكَ وَلِيٌّ مِنَ الدَّلِّ وَكِبْرُهُ تَكْبِيرًا ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ، اللَّهُمَّ ارْحَمْنَا .

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اے اللہ! تو اس سے اعلیٰ واجل ہے کہ تیری کوئی بیوی ہو یا تیری اولاد ہو یا بادشاہی میں تیرا کوئی شریک ہو یا عاجزی و کمزوری کی وجہ سے تیرا کوئی مددگار ہو، اس اللہ کو جان کر اس کی بڑائی بیان کرتے رہو، اے اللہ! ہمیں معاف فرما، اے اللہ! ہم پر رحم فرما!“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳۱۶/۳، وسندہ صحیح)

امام حسن بصری رحمہ اللہ یہ تکبیرات پڑھتے تھے: اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ .

”اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳۱۶/۳، وسندہ صحیح)

یاد رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تکبیرات ثابت پڑھنا ثابت نہیں، سنن دارقطنی (۵۰/۲) والی روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، اس میں عمرو بن شمر راوی ”متروک و کذاب“ موجود ہے۔ جس روایت میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ تکبیرات پڑھتے تھے:

اللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ ، اللَّهُ أَكْبَرُ ، وَلِلَّهِ الْحَمْدُ .

اس کی سند ابواسحاق السیمی کی تدلیس کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ (دیکھیں مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۷/۲)

تنبیہ :

شقیق بن سلمہ سے روایت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نوز والحجہ کو نماز فجر سے لے کر آخری یوم تشریق (تیرہ والحجہ) کو نماز عصر کے بعد تک تکبیرات پڑھتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۵/۲، وسندہ صحیح)

سیدنا علی کے اس فعل مبارک کے خلاف صاحب ہدایہ وغیرہ نے امام ابوحنیفہ کا مذہب نقل کیا ہے کہ یوم عرفہ (نوز والحجہ) کی فجر سے عید کی عصر تک تکبیرات ہیں۔ (الہدایہ: ۱/ ۱۷۵-۱۷۴)

فائدہ :

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل جو مصنف ابن ابی شیبہ (۱۶۵/۲) میں ہے، ابو اسحاق کی تالیس کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے، لہذا امام ابو حنیفہ کا مذہب بے دلیل اور ضعیف ہے۔

ایام قربانی :

قربانی کے تین دن ہیں، جیسا کہ:

۱..... سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: النحر ثلاثة أيام. یعنی: ”قربانی تین دن ہے۔“
(أحكام القرآن للطحاوی: ۲/ ۲۰۵، وسندہ صحیح)

۲..... سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

النحر يومان بعد النحر وأفضلها يوم النحر.

”دسویں ذوالحجہ کے بعد قربانی کے دو دن ہیں، دسویں ذوالحجہ کو قربانی کرنا افضل ہے۔“

(أحكام القرآن للطحاوی: ۲/ ۲۰۵، وسندہ حسن)

۳..... سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ قربانی دسویں ذوالحجہ کے بعد دو دن ہے۔

(مؤطا امام مالک؟؟؟ وسندہ صحیح)

۴..... سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

الأضحیٰ يوم النحر ويومان بعده .

”قربانی دسویں ذوالحجہ اور اس کے بعد دو دن ہے۔“

(السنن الكبرى للبيهقي: ۲۹۷/۹، المحلى لابن حزم: ۷/ ۳۷۷، وسندہ صحیح)

۵..... سلیمان بن موسیٰ الاشدرق تابعی نے کہا کہ قربانی کے تین دن ہیں، تو امام بخاری تابعی کہنے لگے، انہوں

نے سچ کہا ہے۔ (السنن الكبرى للبيهقي: ۲۹۷/۹، وسندہ حسن)

فائدہ :

یاد رہے کہ مسند احمد وغیرہ میں موجود یہ حدیث:

كل أيام التشريق ذبْح .

”ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) کے سارے کے سارے قربانی کے دن ہیں۔“

انقطاع کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

حدیث مصراۃ

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تصروا الابل والغنم، فمن ابتاعها بعد فانہ بخیر النظرین بعد ان يحتلبها، ان شاء امسک وان شاء ردها وصاع تمر.

”(خریدار کو دھوکا دینے کے لیے) اونٹنیوں اور بکریوں کا دودھ نہ روکو، جو ایسا جانور خرید بیٹھے، وہ دو باتوں میں سے ایک کا اختیار رکھتا ہے، چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو اسے مالک کی طرف لوٹا دے، ساتھ کھجوروں کا ایک صاع بھی دے۔“

(صحیح بخاری: ۱/ ۲۸۸، ح: ۲۱۳۸، صحیح مسلم: ۲/ ۵۴۰، ح: ۱۵۲۴)

صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

من اشترى شاة مصراة فهو بالخيار ثلاثة ايام، فان ردها، رد معها صاعا من طعام، لا سمرء.

”جو دودھ روکی ہوئی بکری خرید لے، وہ تین دن (واپس کرنے کا) اختیار رکھتا ہے، اگر واپس کرے تو اس کے ساتھ طعام (کھجور) کا ایک صاع بھی دے، نہ کہ گندم کا۔“

”مُصْرَاةٌ“ سے مراد وہ جانور ہے، جس کا دودھ اس کے تھنوں میں روک دیا گیا ہو۔

اگر کوئی شخص بکری یا اونٹ وغیرہ کو بیچنے کے ارادے سے خریدار کو دودھ زیادہ باور کروانے کے لیے ایک دو دن تھنوں میں دودھ روک رکھے تو یہ کام ناجائز و حرام اور دھوکا ہے، یہ اقدام اس جانور کو عیب دار بنادیتا ہے، اگر کوئی غلطی سے ایسا جانور خرید لے اور بعد میں اسے پتا چل جائے تو تین دن کے اندر واپس لوٹانے کا مجاز ہے، لیکن جب جانور واپس لوٹائے گا تو جو دودھ پیا ہے، اس کے عوض ایک صاع (دوسیر چار چھٹانک) کھجور دے گا۔

آلِ تقلید کے نزدیک یہ متفق علیہ حدیث متروک اور ناقابلِ عمل ہے، اس کو مہمل ثابت کرنے کے لیے ان سے کئی خرافات و ہفوات صادر ہوئی ہیں، جنہیں سن کر اہل کتاب بھی شرم جائیں، براہِ واسِ مؤنث تقلیدِ ناسدید کا جو ہمہ وقت برائی کو جنم دیتی رہتی ہے، اس نے علم و عمل کا جنازہ اٹھا دیا، عمل بالحدیث

کوشدیدا فراتفری اور سنگین گمراہی قرار دیا، جیسا کہ جناب تقی عثمانی دیوبندی لکھتے ہیں:

”اگر ایسے مقلد کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پاکر امام کے مسلک کو چھوڑ سکتا ہے تو اس کا نتیجہ شدیدا فراتفری اور سنگین گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔“

(تقلید کی شرعی حیثیت از تقی: ۸۷)

جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی آلِ تقلید کی شقاوت و ضلالت کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

”اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے، ان کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا، بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں، دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح پر عمل کر لیں۔“

(تذکرۃ الرشید از عاشق الہی دیوبندی: ۱/ ۱۳۱)

جن کے سینوں میں امتی کے قول کے خلاف کوئی آیت یا حدیث سن کر نہ صرف تنگی اور گھٹن پیدا ہو، بلکہ دل سے نفرت و انکار کے شعلے بلند ہوں، وہ دین اسلام کے خیر خواہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایسوں کو اہل سنت کہلانے سے عار کیوں نہیں؟

آلِ تقلید نے حدیثِ مصراۃ سے جو ناروا سلوک کیا ہے، وہ ملاحظہ فرمائیں:

اعتراض نمبر ۱:

حنفی اصول فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حدیثِ مصراۃ میں جو ایک صاع کھجوروں کا ادا کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے، اس کے اور دودھ کے درمیان کوئی توازن نہیں، یہ قیاس کے خلاف ہے، راوی حدیث ابو ہریرہ غیر فقیہ ہیں ”وعلیٰ هذا ترک اصحابنا رواۃ ابی ہریرۃ فی مسالۃ المصراۃ بالقیاس۔“

”اس بنا پر ہمارے اصحاب نے مسئلہ مصراۃ میں ابو ہریرہ کی حدیث کو ناقابلِ عمل قرار دیا ہے۔“

(دیکھیں نور الانوار: ۱۸۳/۱ اصول الشاشی: ۷۵)

جواب:

☆۱ حدیثِ ابی ہریرہ مسئلہ مصراۃ میں نص ہے، نص یعنی واضح دلیل کے مقابلے میں قیاس کرنا شیطانِ لعین کا کام ہے، لہذا ان کا قیاس بھی شیطان کے قیاس کی طرح باطل و مردود ہے، امام محمد بن

سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اول من قاس ابليس:“ (دلیل کے مقابلے میں) سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۴/ ۸۶ وسندہ حسن)

تقلید پرستوں کا یہ کہنا کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے، دراصل منکرین حدیث کی تائید ہے، وہ بھی کتنی ہی احادیث کے رد میں یہی طریقہ اپناتے ہیں، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ سنا دیا ہے کہ تین دن کے اندر اندر جانور واپس کرے اور جتنا دودھ بھی پی لیا ہے، اس کے بدلے ایک صاع کھجور ادا کرے، اب یہ کہنا کہ یہ نبوی فیصلہ قیاس کے خلاف ہے، دودھ اور کھجوروں میں توازن نہیں، واضح انکار حدیث ہے۔ یہاں صحیح حدیث کے خلاف قیاس محض ابلیسی چال ہے۔

جیسا کہ جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی کہتے ہیں:

وهذا الجواب باطل لا يلتفت اليه . یعنی: ”یہ جواب باطل اور ناقابل التفات ہے۔“

(فیض الباری: ۲۳/۳)

☆۲ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غیر فقیہ کہہ کر حدیث کو متروک قرار دینے والوں کو معلوم نہیں کہ یوم حساب آنے والا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”جس نے حدیث پر اس بنا پر طعن کیا کہ اس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقیہ نہیں تھے، لہذا قیاس کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل ہے، وهو كلام آذى قائله به نفسه . (اس نے یہ بات کہہ کر اپنے آپ کا ہی نقصان کیا ہے)۔“ (فتح الباری: ۴/ ۳۶۴)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

قلت : والمعتزلة تقول : لو أن المحدثين تركوا ألف حديث في الصفات والأسماء والرؤية والنزول لأصابوا ، والقدرية تقول : لو أنهم تركوا سبعين حديثا في اثبات القدر ، والرافضة تقول : لو أن الجمهور تركوا من الأحاديث التي يدعون صحتها ألف حديث لأصابوا ، وكثير من ذوى الرأى يروون أحاديث شافه بها الحافظ المفتى المجتهد أبوهريرة رسول الله صلى الله عليه وسلم ، ويزعمون أنه ما كان فقيها ، ويأتوننا بأحاديث ساقطة ، أولا يعرف لها اسناد أصلا محتججين بها .

قلنا : ولكل موقف بين يدى الله تعالى : ياسبحان الله ! أحاديث رؤية الله في الآخرة

متواترة والقرآن مصدق لها ، فأين الانصاف ؟

”معتزلہ کہتے ہیں کہ اگر محدثین اسماء و صفات، روایت اور نزولِ باری تعالیٰ کے بارے میں ایک ہزار احادیث چھوڑ دیتے تو درست کرتے، قدر یہ کہتے ہیں کہ اگر محدثین اثباتِ قدر کے بارے میں مروی ستر احادیث چھوڑ دیتے تو اچھا کرتے، رافضی کہتے ہیں کہ اگر جمہور وہ ہزار حدیث چھوڑ دیں، جن کی صحت کے وہ دعوے دار ہیں تو اچھا کریں گے، اکثر اہل الرائے ایسی احادیث کو بیان کرتے ہیں، جن کو الحافظ، المفتی، المجتہد امام ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا واسطہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، پھر کہتے ہیں کہ وہ فقیہ نہیں تھے، خود دلیل کے طور پر من گھڑت احادیث یا بلا سند روایات پیش کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، آخرت میں روایتِ باری تعالیٰ کی احادیث تو متواتر ہیں اور قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے، (ان کا انکار کرنے میں) انصاف کہاں ہے؟“
(سیر أعلام النبلاء للذہبی: ۱۰/ ۴۵۵)

سیدنا ابو ہریرہ کی عالیشان کرامت:

قاضی ابوالطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم جامع منصور میں ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک خراسانی نوجوان آیا، اس نے جانور کے تھنوں میں دودھ روکنے کے مسئلے میں استفتاء کیا تو ایک محدث نے اس مسئلے میں سیدنا ابو ہریرہ کی بیان کردہ حدیث پیش کی تو وہ خبیث بولا، ابو ہریرہ کی حدیث قبول نہیں، قاضی ابوالطیب نے فرمایا، اس نوجوان نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ جامع مسجد کی چھت سے ایک بہت بڑا سانپ گرا، لوگ بھاگنے لگے اور وہ نوجوان بھی اس سانپ کے آگے دوڑنے لگا، بعد میں یہ سانپ غائب ہو گیا۔ (المنتظم لابن الجوزی: ۱۷/ ۱۰۶، وسندہ صحیح)

☆۳ فقہ الامت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ بھی حدیثِ ابی ہریرہ کے موافق ہے:

من اشترى شاة محفلة فردها، فليردها معها صاعا من تمر.

”جو شخص دودھ روکی ہوئی بکری خرید بیٹھے اور پھر اسے واپس کرنا چاہے، وہ اس کے ساتھ کھجوروں کا

ایک صاع واپس کرے۔“ (صحیح بخاری: ۱/ ۲۸۸، ح: ۲۱۴۹)

سیدنا ابن مسعود کے اس فتوے کا کیا جواب ہے، جو فرمانِ نبوی کے عین مطابق ہے؟

جناب محمود الحسن دیوبندی ”اسیر مالٹا“ لکھتے ہیں:

”مصراتہ کی حدیث کا جو جواب صاحبِ نور الانوار دیتے ہیں، وہ ہرگز درست نہیں، کیونکہ اگر

ابو ہریرہ غیر فقیہ تسلیم کر لیے جائیں تو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جس کو بخاری نے تخریج کیا

ہے، اس کا کیا جواب ہوگا؟“ (تقاریر شیخ الہند: ۸۴۳)

جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں:

”ومن یجتري علی ابی ہریرۃ فیقول: انه کان غیر فقیہ؟ ولو سلمنا، فقد یرویہ افقہم

اعنی ابن مسعود ایضا، فیعود المحذور.

”کون سیدنا ابو ہریرہ کے خلاف جسارت کر کے یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ غیر فقیہ تھے؟ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر بھی لیں تو فقیہ صحابہ یعنی سیدنا ابن مسعود نے بھی اسے بیان کیا ہے، لہذا اعتراض پھر لوٹ آیا۔“

(فیض الباری: ۳۳۷/۳)

اعتراض نمبر ۲:

جناب حسین احمد مدنی دیوبندی لکھتے ہیں:

”آپ کا یہ فیصلہ بطور قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بلکہ ایک جزئی واقعہ میں آپ نے اسے فرمایا تھا، راوی نے روایت بالمعنی کے طور پر اسے قاعدہ کلیہ بنا لیا، بہر حال چوں کہ روایت مصراۃ قواعد کلیہ کے خلاف

ہے۔۔۔۔“ (تقریر ترمذی از حسین احمد: ۶۷۸)

جواب:

یہ سخت مغالطہ ہے اور شریعت اسلامیہ کو مشکوک قرار دینے کی مذموم سازش ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ”من اشتری شاة“ میں ”من“ عموم کے لیے ہے، یہ حکم کلی طور پر عام ہے، سیدنا ابن مسعود کا فتویٰ بھی اس بات کی عکاسی کرتا ہے۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

قالوا: هو مخالف الأصول، فقلنا: كذبتم، بل هو أصل من كبار الأصول، وإنما المخالف للأصول قولكم في الوضوء من القهقهة في الصلاة خاصة، وقولكم بأن القلس لا ينقص الوضوء أصلا، إلا إذا كان مائلا الفم، وقولكم في جعل الآبق أربعين درهما إذا كان على مسيرة ثلاث، وقولكم في عين الدابة ربع ثمنها، والوضوء بالخمر، وسائر تلك الطوام التي هي بالمضاحك ربما يأتي به المبرسم أشبه منها بشرائع الاسلام.

”احناف کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اصول (قیاس) کے خلاف ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ تو تمہارا جھوٹ ہے، بلکہ یہ حدیث (اسلام کے) عظیم الشان اصولوں میں سے ایک اصول ہے، قیاس کے خلاف تو

تمہاری یہ بات ہے کہ صرف نماز میں قہقہہ ناقض وضو ہے اور یہ بات کہ قے منہ بھر کر نہ ہو تو بالکل ناقض وضو نہیں، نیز یہ کہنا کہ اگر غلام تین دن کی مسافت بھاگ گیا ہو تو اس پر چالیس درہم (جرمانہ) ہے، جانور کی آنکھ (ضائع کرنے) میں اس کی کل قیمت کا چوتھائی حصہ (جرمانہ) ہے اور شراب (پختہ نبیذ) سے وضو وغیرہ جیسے اور بھی کئی مضحکہ خیز مسائل ہیں کہ بسا اوقات پاگل آدمی بھی ان سے بڑھ کر اسلامی اصولوں سے ملتی جلتی بات کر دیتا ہے۔“ (المحلی: ۶/۶۷-۶۸)

اعتراض نمبر ۳:

جناب حسین احمد ”مدنی“ دیوبندی شریعت کا یوں مذاق اڑاتے ہیں:

”تو جب دودھ ملک مشتری (خریدار کی ملکیت) ہے، کیونکہ کھلایا پلایا اس نے ہے، تو اب اس سے ایک صاع کا مطالبہ کرنا کہاں کا انصاف ہے؟“ (تقریر ترمذی از حسین احمد: ۶۷۷)

جواب:

یہ فیصلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، آپ کا ہر فیصلہ عدل و انصاف پر مبنی ہے، مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ و رسول کا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول کریں، ضدی اور معاند نہ بنیں، فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا﴾ (الأحزاب: ۳۶)

”کسی مومن مرد اور عورت کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو اس کے لیے کوئی اختیار باقی رہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، وہ واضح گمراہ ہو گیا۔“

اعتراض نمبر ۴:

نیز کہتے ہیں:

”امام صاحب (ابو حنیفہ) فرماتے ہیں کہ یہ تصریح (جانور کے تھنوں میں دودھ روکنا، یہ باور کرانے کے لیے کہ یہ جانور بہت دودھ دینے والا ہے) عیب نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ عقد (لین دین) کا مقتضایہ ہے کہ بیع (فروخت شدہ جانور) عیوب سے خالی ہو، یہ عیب جو دودھ میں ہے، یہ اس کے ثمرات و منافع اور زوائد میں ہے، جس کی وجہ سے نفس بیع پر کوئی اثر نہیں پڑتا، خواہ دودھ کم ہو یا بہت، لہذا بیع کا فسخ کرنا اور بیع (فروخت شدہ جانور) کا رد کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ یہ بیع لازم ہوگئی، مشتری (خریدار) اور قاضی

کو اس کے فسخ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ (درس ترمذی از حسین احمد: ۶۷۵)

جواب:

جانور واپس لوٹانے کا حق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ہے اور آپ کا عطا کردہ حق کیوں چھینا جا رہا ہے؟ اس بات سے کچھ کچھ واقف ہے کہ جانور کے تھنوں میں دودھ روکنا، یہ باور کرانے کے لیے کہ یہ جانور بہت زیادہ دودھ دینے والا ہے، صریح دھوکا اور عیب ہے، خریدار نے جب جانور خریدا تھا، اس کے دودھ کی زیادتی کو دیکھ کر، جبکہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جانور تو ادا کردہ قیمت کے مطابق بہت کم دودھ دیتا ہے، تو یہ واضح عیب ہے، اس عیب کے باوجود اگر وہ بیع فسخ نہ کرنا چاہے، تو نہ کرے، یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔

قارئین! کتنی بڑی جسارت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو فسخ کا حق دیں، اس وجہ سے کہ اس جانور میں عیب ہے، لیکن تقلید پرست یہ کہیں کہ یہ عیب نہیں ہے، لہذا فسخ کا کوئی حق نہیں، فرمائیں! یہ حدیث کا اتباع ہے یا مخالفت؟ آپ اس کو کیا نام دیں گے؟

اعتراض نمبر ۵: جناب حسین احمد ”مدنی“ دیوبندی کہتے ہیں:

”یہ دوسری بات ہے کہ بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدنے والا) باہمی رضامندی سے رد کرنا چاہیں تو یہ جائز ہے۔“ (تقریر ترمذی از حسین احمد: ۶۷۵)

جواب: یہ ہوا پرستی ہے، ”باہمی رضامندی“ کہاں سے لے آئے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خریدار کو ان الفاظ میں اختیار دیا ہے کہ ((ان شاء أمسک، وان شاء ردّها وصاع تمر)) ”اگر چاہے تو پاس رکھ لے اور اگر چاہے تو جانور ایک صاع کھجوروں کے ہمراہ واپس کر دے“۔ اگر خریدار اپنا یہ حق استعمال کرنا چاہے تو بیچنے والے پر نبوی فرمان کے مطابق لازم ہے کہ وہ یہ جانور واپس لے، بصورت دیگر حدیث کا مخالف ٹھہرے گا اور سخت گناہ گار ہوگا۔

اعتراض نمبر ۶:

جناب محمد سرفراز خان صفدر دیوبندی لکھتے ہیں:

”یہ حدیث قرآنی ضابطہ ﴿فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ﴾ سے متعارض ہے
(فتح القدیر: ۲، ۱۴۷) یعنی تلف شدہ چیز کا تاوان بالمثل ہوتا ہے، عام اس سے کہ مثل صوری ہو یا

معنوی، یعنی قیمت اور ”صاع من تمر“ (ایک صاع کھجوریں) نہ تو مثل لبن (دودھ کی مثل) اور نہ قیمت لبن ہے۔“ (الکلام المفید: ۲۷۲-۲۷۳، خزائن السنن: ۵۴۸)

جواب:

☆۱ یہ منکرین حدیث کی روش ہے کہ حدیث کو قرآن کے معارض قرار دے کر ترک کر دیتے ہیں۔
یہ مدعی اسلام تو ہیں، ساتھی ہیں مگر بیگانوں کے
تقویٰ کی وہ بوہی ان میں نہیں، وہ رنگ نہیں ایمانوں کے
جناب سرفراز خان صفدر خود لکھتے ہیں:

”صحاح ستہ کی صحیح احادیث میں سے کوئی حدیث قرآن کریم کی کسی بھی آیت کریمہ کے ہرگز خلاف نہیں، اگر کسی کوتاہ فہم کو صحاح ستہ کی کسی حدیث کا قرآن کریم کی کسی آیت کریمہ سے تضاد نظر آتا ہے تو وہ اس کی اپنی سو فہم کا نتیجہ ہے، ایسا سطحی قسم کا تعارض تو قرآن کریم کی بعض آیات کریمات کا آپس میں بھی معلوم ہوتا ہے۔“ (شوق حدیث از صفدر: ۱۵۳)

☆۲ اس آیت کریمہ کا تعلق عقوبات (تعزیرات) سے ہے، جبکہ اس حدیث کا تعلق اموال کے ساتھ ہے، اموال کا تاوان کبھی بالمثل ہوتا ہے اور کبھی بالمثل نہیں ہوتا۔

☆۳ اگر ایک صاع کھجوریں نہ دودھ کی مثل صوری ہیں نہ مثل معنوی یعنی قیمت ہیں تو یہ مثل شرعی ہوں، کیونکہ اس دودھ کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کی ہے، لہذا اس میں چوں چوں اس کی کیا ضرورت ہے؟

اعتراض نمبر ۷: صفدر صاحب مزید لکھتے ہیں:

”یہ حدیث ((الخراج بالضمن)) کی حدیث کے خلاف ہے (ابو داؤد: ۲/ ۳۵۸۱) وسندہ حسن۔ غ۔ م) یعنی جو شخص کسی چیز کے نقصان کو برداشت کرتا ہے تو چیز کا نفع بھی اس کا ہوگا، چونکہ مشتری (خریدار) دودھ دینے والے جانور کا خرچہ اٹھاتا ہے، اس لیے اس کے دودھ کا حقدار بھی وہی ہے، جو عادتاً چارہ کی قیمت سے زیادہ ہوتا ہے، اس کے بدلے میں اسے بائع (بیچنے والے) کو کچھ بھی نہیں دینا پڑتا، جبکہ حدیث المصراۃ میں ”صاع من التمر“ (ایک صاع کھجوروں کا) دینا پڑتا ہے۔“

(الکلام المفید از صفدر: ۲۷۳)

جواب : ☆ یہ ساری کی ساری باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد نظر تھیں، اس کے باوجود آپ نے ایک صاع کھجوریں بھی دینے کا حکم فرمایا، دراصل یہ نبوی فیصلے کو چیلنج ہے، جو صرف آلِ تقلید کی عدالت کے حصے میں آیا ہے، یہ خواخواہ احادیث میں تعارض پیدا کر کے آسان مسائل کو الجھانے والی بات ہے، حدیث ((الخراج بالضمنان)) عام ہے اور حدیث مصراۃ خاص ہے، عام اور خاص میں تعارض ہو تو خاص کو مقدم کرتے ہیں، لہذا تعارض ختم ہوا۔

امام طحاوی نے حدیث مصراۃ کو حدیث ((الخراج بالضمنان)) کے معارض قرار دیا، اس کے جواب میں جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی کہتے ہیں:

اقول : ان هذا الجواب ليس بذاك القوی . ”یہ کوئی ٹھوس (تسلیم بخش) جواب نہیں۔“

(العرف الشذی از کشمیری: ۱/ ۳۶۸)

اعتراض نمبر ۸: جناب سرفراز خان صفدر دیوبندی لکھتے ہیں:

”طعام کی طعام کے ساتھ ”نسیئۃ“ (ادھار) بیع جائز نہیں، دودھ اور تمر (کھجور) کا طعام ہونا تو واضح ہے اور ”نسیئۃ“ (ادھار) بھی ظاہر ہے کہ دودھ دوہنے کا زمانہ کیا ہے اور ”صاع من التمر“ (ایک صاع کھجوریں) ادا کرنے کا زمانہ کیا ہے؟ اور حدیث المصراۃ اس کے خلاف ہے۔“

(الکلام المفید از صفدر: ۲۷۳)

جواب : یہ بیع (خرید و فروخت) نہیں ہے، بلکہ بیع کے منعقد ہو جانے کے بعد دودھ کی کمی کی صورت میں ایک عیب ظاہر ہوا ہے، جو بیع کے فسخ کا سبب بنا ہے، اس وقت ایک صاع کھجوریں ادا کرنے کا نبوی حکم ہے، اس کو بیع قرار دینا نری جہالت اور دھوکہ دہی ہے۔

باقی رہا طعام کی طعام کے ساتھ ادھار بیع کا جائز نہ ہونا تو اس کا تعلق کچھ اجناس کے ساتھ ہے، دودھ ان اجناس میں شامل نہیں۔

اعتراض نمبر ۹: جناب صفدر مزید لکھتے ہیں:

”جزاف (تخمینہ والی چیز) کو مکمل و موزون (جس کا وزن کیا گیا ہو) کے مقابلہ میں پہچانا جائز نہیں ہے اور یہاں دودھ جزاف (تخمینہ والی چیز) ہے اور وہ مجہول ہے اور ”صاع من التمر“ (ایک صاع کھجور) معلوم ہے اور حدیث المصراۃ اس طے شدہ قاعدہ کے خلاف ہے۔“ (الکلام المفید: ۲۷۳)

جواب: جب یہ بیج ہی نہیں تو طے شدہ قاعدہ کے خلاف کیسے؟ نبوی فیصلے کے مطابق ایک صاع کھجوریں تمام دودھ کا شل ہیں۔

اعتراض نمبر ۱۰: جناب سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

”امام طحاوی فرماتے ہیں کہ حدیث مصراۃ پہلے کی ہے اور حرمتِ ربا (سود کی حرمت) کا حکم اس کے بعد کا ہے اور چونکہ ربا (سود) حرمتِ نصِ قطعی اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، لہذا اس کا حکم منسوخ ہے۔“ (الکلام المفید از صفدر: ۲۷۳)

جواب: امام طحاوی حنفی کا دعویٰ نسخِ بلا دلیل ہے، ان کی عادت ہے کہ بغیر دلیل کے نسخ کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

لکنہ بکثر من ادعائه النسخ بالاحتمال فجری علی عادتہ.

”محض احتمال کی بنیاد پر کثرت سے دعویٰ نسخ آپ کی عادت ہے۔“ (فتح الباری: ۹/ ۴۷۸)

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

و نجد كثيرا من الناس ممن يخالف الحديث الصحيح من أصحاب أبي حنيفة أو غيرهم يقول: هذا منسوخ وقد اتخذوا هذا محنة، كل حديث لا يوافق مذهبهم يقولون: هو منسوخ من غير أن يعلموا أنه منسوخ ولا يثبتوا ما الذي نسخه.

”ہم نے کثیر تعداد میں امام ابوحنیفہ کے پیروکاروں وغیرہ کو پایا ہے جو صحیح حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے، یہ ان کا وطیرہ ہے کہ ہر حدیث جو ان کے مذہب کے مطابق نہ ہو، بغیر علم کے اس کو منسوخ قرار دیتے ہیں، وہ اس حدیث کا دلیل سے ناسخ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔“

(مجموع الفتاوی: ۲۱/ ۱۵۰)

اس مسئلہ میں بھی حدیث کی مخالفت کرنے والوں نے یہی روش اختیار کی ہے، منسوخیت کا بے بنیاد دعویٰ کر دیا ہے، سیدنا ابن مسعود کا فتویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔

اعتراض نمبر ۱۱: جناب سرفراز خان صفدر دیوبندی لکھتے ہیں:

”امام طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ((نہی عن بیع الکالی بالکالی یعنی الذین بالذین)) کے خلاف ہے (طحاوی: ۲۰/ ۱۶۹) یعنی نہ تو ابھی تک مشتری (خریدار) نے پورا دودھ وصول کیا اور نہ بائع

(بیچنے والے) نے تمر (کھجوروں) کا صاع وصول کیا تو یہ دین بالدين ہے، جس سے نبی آئی ہے، یہ روایت رافع بن خدیج سے بھی مرفوعاً مروی ہے (نصب الراية: ٤/ ٤٠٧ عن الطبرانی) اور حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی مرفوعاً مروی ہے، ان کی روایت دارقطنی (٣١٩) ، سنن کبریٰ بیہقی (٢٩٠/ ٥) وغیرہ۔۔۔“
(الکلام المفید: ٢٧٣-٢٧٤)

جواب: یہ حدیث سنن الدارقطنی (٤١/ ٣)، ح: ٣٠٣١-٣٠٣٢، البرار (کشف الاستار: ١٢٨)، المعجم الکبیر للطبرانی (٢٣٤٥)، السنن الکبریٰ للبیہقی (٢٩٠/ ٥)، المستدرک للحاکم (٥٤/ ٢) میں آتی ہے، اس کی سند ”ضعیف“ ہے، موسیٰ بن عبیدہ الربذی راوی ”ضعیف“ ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:
فان الربذی ضعیف عند اکثرین .

(تفسیر ابن کثیر: ٤/ ١٤٨، سورۃ بنی اسرائیل، تحت آیت: ٤٤ بتحقیق عبد الرزاق المہدی)

دارقطنی اور حاکم کی سند میں موسیٰ بن عقبہ ہے، زلیعی حنفی لکھتے ہیں:

وغلطهما البیہقی وقال: انما هو موسیٰ بن عبیدۃ الربذی (نصب الراية: ٤/ ٤٠٧)
لہذا امام حاکم وغیرہ کا اسے ”صحیح“ کہنا ”صحیح“ نہیں۔

مصنف عبد الرزاق (٩٠/ ٨، ح: ١٤٤٤) کی سند میں ابراہیم بن ابی یحییٰ الاسلمی ”ضعیف“ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس مسئلہ پر اجماع ہے (نبیل الاوطار: ٥/ ١٦٦) تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ حدیث مصرعہ میں جو تین دن کے اندر اندر واپسی کا اختیار دیا گیا ہے، ان دنوں میں جو دودھ پیا ہے، اس کے عوض میں ایک صاع کھجوریں دے گا، یہ دودھ اور کھجوروں کی بیچ نہیں ہے، بلکہ نبوی فیصلہ ہے، جسے تقلید پرست سودا ور نہ معلوم کیا کیا نام دے رہے ہیں، فقیہ امت سیدنا ابن مسعود کا فتویٰ اس بات پر دال ہے کہ یہ حدیث مصرعہ شریعت کی کسی نص کے خلاف نہیں، اندھی تقلید اتنی سی بات ذہن میں نہیں آنے دیتی۔

اعتراض نمبر ١٢: جناب سرفراز خان صفدر دیوبندی لکھتے ہیں:

”اکابر علمائے دیوبند کا اس حدیث پر عمل ہے، فیض الباری (٢٣٧/ ٢)، العرف الشذی (٢٣٦) اور بواہر النوار (١٠٧) میں ہے کہ حدیث المصرعہ صلح اور مشورہ پر محمول ہے اور صلح و دیانت اور مشاورت مساوات کے قیاسی اصول سے بالاتر معاملہ ہوتا ہے۔“ (خزائن السنن: ٤٩-٥٠)

جواب: خواہشات پرستی اسی کا نام ہے کہ جو جی میں آئے کریں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ کلیہ اور ضابطہ بنا کر کیا ہے، جو دیوبندیوں کو قطعاً قبول نہیں، یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ آپ نے بائع اور

مشتری کو بلا کر صلح کروائی تھی اور مشتری کو کہا تھا کہ ایک صاع کھجوروں کا بھی واپس کرو؟ حاشا وکلا ایسے نہیں ہے، بلکہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ سنایا ہے اور ایک کلیہ وضابطہ بتایا ہے، مزید فقیہ الامت سیدنا ابن مسعود کا فتویٰ سونے پر سہاگہ ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

رد محکم الصحیح الصریح فی مسألة المصراة بالمتشابه من القياس ، وزعمهم أن هذا الحديث يخالف الأصول فلا يقبل ، فيقال : الأصول كتاب الله وسنة رسوله واجماع أمته والقياس الصحیح الموافق للكتاب والسنة ، فالحديث الصحیح أصل بنفسه ، فكيف يقال : الأصل يخالف نفسه ؟ هذا من أبطل الأباطيل ، والأصول في الحقيقة اثنان لا ثالث لهما : كلام الله وكلام رسوله ، وما عداهما فمردود اليهما ، فالسنة أصل قائم بنفسه ، والقياس فرع ، فكيف يرد الأصل بالفرع ؟ وقد تقدم بيان موافقة حديث المصراة للقياس وابطال قول من زعم أنه خلاف القياس ، وأما القياس الباطل فالشريعة كلها مخالفة له ، وبالله العجب ! كيف وافق الموضوع بالنبيذ المشتد لأصول حتى قبل وخالف خبر المصراة للأصول حتى ردّ.

”(احناف نے) مسئلہ مصراة میں صحیح وصریح نص کو قیاس کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ حدیث اصول (قیاس) کے خلاف ہے، لہذا قبول نہیں کی جائے گی، ان کو جواباً یوں کہا جائے گا کہ اصول تو اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت، اجماع امت اور صحیح قیاس کا نام ہے اور صحیح قیاس وہ ہے جو کتاب و سنت کے مطابق ہو، چنانچہ صحیح حدیث خود ایک مستقل اصل ہے، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایک اصل اپنے ہی خلاف ہے؟ یہ باطل ترین بات ہے، درحقیقت اصول دو ہی ہیں، تیسرا کوئی نہیں، یعنی قرآن و حدیث، ان کے علاوہ ہر بات انہی کی طرف لوٹائی جائے گی، معلوم ہوا کہ حدیث اصل ہے اور قیاس فرع ہے، فرع کی وجہ سے اصل کو کیونکر چھوڑا جاسکتا ہے؟ حالانکہ پہلے حدیث مصراة کا قیاس کے مطابق ہونا بیان ہو چکا ہے، یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اسے خلاف قیاس سمجھنا باطل ہے، نیز شریعت کا کوئی حکم قیاس صحیح کے خلاف نہیں، رہا قیاس باطل تو ساری شریعت ہی اس کے مخالف ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ گاڑھے نبیذ سے وضو کرنا قیاس کے مطابق سمجھ کر کیسے مان لیا گیا اور

حدیث مصراة قیاس کے خلاف سمجھ کر کیسے چھوڑ دی گئی؟“ (اعلام الموقعین: ۳۱۷/۲)

تفسیر الزمخشری (۶۱۷.....۵۳۸ھ)

مفسر کا نام: ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد الخوارزمی، الحنفی، المعتزلی، لقب ”جار اللہ“ ہے۔

تفسیر کا نام: الکشاف عن حقائق التنزل و عیون الأقاویل فی وجوه التأویل۔

عقیدہ: فقہ معتزلہ کے امام ہیں، اپنے مذہب کی خوب حمایت کرتے ہیں اور اس کی تائید میں دلیل و حجت کی جتنی بھی قوت و طاقت ان کے پاس ہوتی ہے، صرف کرتے ہیں۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

”صَالِحٌ، لَكِنَّهُ دَاعِيَةٌ إِلَى الْإِعْتِزَالِ أَجَارَنَا اللَّهُ، فَكُنْ حَذِرًا مِنْ كُشَافِهِ۔“

”وہ صالح آدمی ہیں لیکن معتزلی مذہب کے پر جوش داعی ہیں، اللہ ہمیں محفوظ رکھے، لہذا ان کی کتاب ”الکشاف“ سے بچ کر رہیں۔“ (المیزان ۷۸/۴)

ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ آیات سے اپنے باطل مذہب کی تائید حاصل کریں، اس کے خلاف آنے والی آیات کی تاویل کریں اور کفار کے بارے نازل ہونے والی آیات کو ان اہل السنۃ والجماعہ پر چسپاں کریں، جن کو موصوف حشوئیۃ، مُجَبَّرۃ اور مُشَبَّہۃ کا نام دیتے ہیں۔

تفسیرِ ہذا کی عمومی خصوصیات: ان کی تفسیر بجمال قرآن اور اس کے سحرِ بلاغت کے بیان میں منفرد ہے، کیونکہ وہ لغتِ عرب سے واقفیت اور ان کے اشعار کی خوب معرفت رکھتے ہیں، لیکن وہ قرآنی آیات سے اندازِ بلاغت میں اپنے باطل معتزلی مذہب کے دلائل تراشتے ہیں، چنانچہ اس تفسیر سے پچھائی بہتر ہے، خاص طور پر اس کو، جو اس میدان میں نو وارد ہو۔

مسائل فقہیہ: فقہی مسائل میں زیادہ تر تفصیل نہیں کرتے اور اپنے مذہب حنفی میں متعصب نہیں، بلکہ معتدل ہیں۔

لغت، نحو اور شعر: قرآن کریم میں معانی اور بیان کی جو دولتِ بلاغت موجود ہے، اسے اہتمام سے بیان کرتے ہیں، لیکن جب ایسا لفظ آجائے، جو ان کے مذہب کے موافق نہ ہو، تو ظاہری معنی کو ترک کرنے، لغت میں موجود کوئی دوسرا معنی دینے یا اسے مجاز، استعارہ اور تمثیل قرار دینے میں کوئی کسر اٹھانے نہیں رکھتے۔

اسرائیلی روایات میں آپ کا انداز: اسرائیلی روایات بہت کم بیان کرتے ہیں، ان کو ”ذوی“ کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں یا آخر میں ”واللہ أعلم“ کہہ دیتے ہیں، لیکن انہوں نے ہر سورت کی تفسیر کے آخر میں اس کے فضائل میں ”موضوع“ (من گھڑت) احادیث بیان کی ہیں۔